کی صحت و صفائی کا بڑا خیال تھا، جس کا شاہد پورا کلام ہے، اس اعتبار سے یہ کلام اردو کے اچھے سے اچھے شاعر کے کلام کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکتا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ یہ اسی قوم کے فرد کی زبان ہے جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان سے اسکو کوئی تعلق نہین۔

رازونیاز، جناب حبیب اشعر دہلوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مرقوم نہین، پتہ دائرۃ الادب محلہ رودگران دہلی،

جناب حبیب اشعر دہلوی ہونہار نوجوان شعراء مین ہین، ان کی غزلین معارف مین بھی نکلتی رہتی ہین، "رازونیاز" کے نام سے اونھون نے اپنے کلام کا مجموعہ شائع کیا ہے، ان کا کلام جدید رنگ تغزل کا اچھا نمونہ ہے،

مفتاح العربیہ حصہ اول و دوم مؤلفہ جناب قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی تقطیع بڑی ضخامت ۴۰، ۱۱۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ہر دو حصہ ۱۲؍ پتہ :۔ مکتبہ علمیہ مطبع مجتبائی میرٹھ و حافظ محمد سعید ہاشمی تاجر کتب کوچہ چیلان دہلی،

اردو مین عربی زبان کی جو ریڈرین لکھی گئی ہین ان مین کم ایسی ہین جنمین جدید طرز پر صرف ونحو کی تعلیم قدیم و جدید ادب اور ترجمہ وانشا، ہر پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہو، اس ضرورت کو پیش نظر رکھکر مؤلف نے یہ کتاب تالیف کی ہے، پہلے حصہ مین صرف ونحو کے ضروری قواعد، عربی جملون سے انکی تشریح، مشق، روزمرہ کے الفاظ، انکا استعمال، چھوٹے چھوٹے جملون کا املاء، وانشا، جن مین زیادہ تر حکیمانہ اقوال اور احادیث نبوی ہین، دوسرے حصہ مین عربی کی مفید اور سبق آموز حکایتین، مختلف ضروریات کے خطوط اور ان کے جوابات اور جدید اخبارات و رسائل کے اقتباسات مع ترجمہ ہین، ان سب مین تدریجی تعلیم، مشق، املاء، وانشاء اور روزانہ کے الفاظ کے استعمال کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا ہے، دونون حصون کے آخر مین کثیر الاستعمال جدید الفاظ کی ڈکشنری بھی دیدی گئی ہے، ابتدائی عربی تعلیم کے لئے دونون کتابین مفید ہین، (م)

جلد ۴۵ "ماہ ربیع الاول ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۴۰ء" عدد ۵

مضامین

شذرات

گذشتہ مارچ میں ابھی دکن کے سفر سے کمر کھولی تھی کہ شمال کے سفر کو آمادہ ہونا پڑا، طلب دو تعلیمی مرکزوں سے تھی، اسلامیہ کالج پشاور اور صادق ایجرٹن کالج بہاولپور، لاہور ان دونوں سفروں کا ریلوے سنگم تھا، ۶، مارچ سے سفر کا آغاز ہوا، اور ۲۳ کو ختم ہوا، یہ دن لکھنؤ، پشاور، لاہور، بہاولپور اور امرتسر میں گذرے،

لاہور سے آگے بڑھنے کے ساتھ ایک نئے تمدن، نئی زبان اور نئے لباس سے سابقہ پڑنے لگتا ہے، لیکن اٹک سے پار ہونے کے ساتھ تو ہندوستان کی دنیا ہی بدل جاتی ہے، اور ہمالیہ کا سایہ دور سے دکھائی دینے لگتا ہے، پتھریلی زمین اور جمی ہوئی مٹی کے ٹیلے اور دریا پہ دریا ملتے ہیں، خشک و تر میووں کے ڈھیر کے ڈھیر ہر جگہ نظر آتے ہیں، مضبوط اور قوی ہیکل انسان ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں، مگر ان مضبوط سینوں میں مہمانوں اور نوواردوں کے لئے موم سے نرم دل ہوتے ہیں،

لاہور سے ۸، مارچ کو صبح ۸ بجے چل کر رات کو ۸، بجے گاڑی پشاور پہنچی، اسلامیہ کالج کے نائب سکریٹری اور ندوی احباب اسٹیشن پر موجود تھے، چونکہ کالج کا بلایا ہوا آیا تھا

اس لئے کالج ہی کے احاطہ میں مولوی نور الحق صاحب ندوی ازہری ناظم دینیات کالج کے بنگلہ میں اترا، پشاور کئی بار جا چکا ہوں اور کالج کے اساتذہ کی خدمت میں بھی پہلے سے نیاز حاصل تھا، اس لئے ۹-۱۰-۱۱ تین دن احباب کی ملاقات، دوستوں کی بات چیت، علمی سوال و جواب، اسلامیہ کالج کے شعبۂ دینیات وطب کی ترتیب نصاب، اور طلبہ اور عام مسلمانوں کے سامنے چند تقریروں میں گذرے،

اسلامیہ کالج پشاور صوبہ سرحد کا واحد اسلامی کالج ہے، اور شہر پشاور سے ۴ میل دور باہر واقع ہے، بڑا احاطہ ہے جس میں کالج کی عمارت، مختلف بورڈنگ، مسجد، کتبخانہ، استادوں کے بنگلے اور دوسری عمارتیں ہیں اور خود اس کی اچھی خاصی آبادی اور مستقل چہل پہل ہے، تین سو طلبہ تعلیم پاتے ہیں،

تقریب یہ تھی کہ سرکار نظام نے کالج کو ابھی حال میں ڈیڑھ لاکھ کی رقم اس غرض سے دی تھی کہ وہاں عثمانیہ بورڈنگ ہوس قائم کیا جائے، اس بورڈنگ کی رسم افتتاح ادا کرنے کے لئے سر اکبر حیدری صدر اعظم سرکار نظام تشریف لا رہے تھے اسی موقع پر کالج نے اپنی اس تجویز کے لئے بھی تاریخ مقرر کی کہ کالج کے ماتحت ایک ایسا شعبہ کھولا جائے جس میں بعض پڑھے لکھے نوجوانوں کو مختصر عربی، دینیات اور طب کی تعلیم دی جائے جو گاؤں میں پھیل کر اور علاج و معالجہ کے ذریعہ اپنی روزی کمائیں، اور مسلمانوں کی مذہبی خدمت کریں،

۹ر مارچ کی صبح کو کالج کی مسجد میں طلبہ اور اساتذہ کے سامنے "اسلامی کالجوں کے اصلی خصوصیات" پر تقریر کی، اس کے بعد کالج کے میدان میں آکر کالج کا علم لہرایا، اور اس موقع پر اس موقع کے مناسب تھوڑی تقریر کی،

میں پوچھا کہ اگر کسی انجینئرنگ کالج میں انجینئرنگ کی اور طبی کالج میں طب کی تعلیم نہ ہو تو کیا اس کو انجینئرنگ کالج یا طبی کالج کہنا جھوٹ نہ ہوگا، اسی طرح اگر کسی اسلامی کالج یا اسلامی یونیورسٹی میں اسلام کی علمی و عملی تعلیم نہ ہو تو اس کو نام کا فریب کیوں نہ کہا جائے،

۱۰ر مارچ کا دن مجوزہ شعبۂ دینیات کے نصاب کی ترتیب میں گذرا، اور شب کو ۹ بجے شہر کے مسلمانوں کے سامنے سیرت کے موضوع پر ایک تقریر ہوئی جس کے آخر میں مسلمانوں کو "خیر الامم" کا جو لقب دربار الٰہی سے ملا ہے اس کی تشریح کی گئی، اور بتایا گیا کہ دنیا میں اور اس ملک میں ہر مسلمان کو یقین رکھنا چاہئے کہ توحید کے علم بردار، قرآن پاک کے حامل اور خیر الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ان سے اونچا اور ان سے بہتر کوئی نہیں، خودی کا یہ راز درحقیقت قوموں کی زندگی کا راز ہے،

۱۱ر کو ظہر کی نماز کے بعد طلبہ اور اساتذہ کا ایک اور مجمع ہوا، جس میں تقریر کا عنوان یہ تھا، کہ سب سے بڑی اسلامی اکثریت والے صوبہ کے نوجوانوں کی حیثیت سے اُن کالج کے نوجوان مسلمانوں کا فرض کیا ہونا چاہئے، ان کو اپنے ایمان و عمل میں اتنا آگے بڑھنا چاہئے کہ سارے ہندوستان کے مسلمان ان کے پیچھے چلیں،

اسی تاریخ کی شام کو پشاور سے چلا اور ۱۲ر کی صبح کو لاہور پہنچا، خواجہ عبد الوحید صاحب سکریٹری اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ ان کے مکان آیا، صرف ۲۴ گھنٹے قیام رہا، خدام الدین کے حلقۂ درس کے بعض احباب نے ملاقات اور گفتگو کا شرف بخشا، ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی، مولانا ابو الاعلیٰ صاحب مودودی، مولانا داؤد صاحب غزنوی اور بہت سے احباب علم و دین میزبان کے دسترخوان پر تھے، دیر تک علمی و قومی مسئلوں پر مبادلۂ خیال رہا، نماز ظہر کے بعد جلسہ منتشر ہوا،

عصر کے وقت پروفیسر ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب کے گھر پر لاہور کے بہت سے اہل علم و ادب چائے کی دعوت پر جمع ہوئے، اور دیر تک علمی و ادبی گفتگو کے چرچے رہے، پروفیسر سید عبد اللہ اس وقت پنجاب کے سنجیدہ فکر نوجوانوں میں خاص ذکر کے قابل ہیں، اور امید ہے کہ ان کی تصنیفات سے پنجاب کی سنجیدہ نگاری کا پایہ بلند ہوگا، مغرب کی نماز پر اس جلسہ کا خاتمہ ہوا،

رات کا کھانا پرانے دوست پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے یہاں تھا، مجلس میں ڈاکٹر تاثیر پرنسپل اسلامیہ کالج امرتسر اور ایک اور نوجوان شاعر کے سبب سے جن کا نام یاد نہیں رہا بڑی دلچسپی رہی، یعنی طعام کی لذت کے ساتھ کلام کی لذت بھی حاصل ہوئی، نوجوان شاعر نے اپنی نظمیں سادہ لہجہ میں سنائیں، ان کے کلام میں جوش اور گرمی تھی، لیکن طرز ادا اور طریق تعبیر انگریزی تھا، پھر پروفیسر تاثیر نے اپنا ایک "نالۂ نیم شبی" فارسی میں سنایا، صوفی تبسم صاحب نے اپنا صوفیانہ کلام پڑھا، اور آخر میں ایک

غیر شاعر نے بھی دو چار شعر اپنے پڑھے، اس سخن درازی میں لیلائے شب کی زلفیں ناکمر پہنچ گئیں،

۱۳ر کی صبح کو بہاولپور کی روانگی ہوئی، یہ بہاولپور کو میرا پہلا سفر تھا، گو بہاولپور ٹھہرے بغیر سفر کابل سے واپسی میں ادھر سے ایک دفعہ گذر ہو چکا تھا، لاہور سے چند اسٹیشنوں کے بعد صحرائے سندھ کے گرد و غبار نے گاڑی کی فضا کو مکدر کر دیا، اس قدر گرد و غبار کی ارزانی شاید ہی کسی اور لائن میں ہو، ۳، بجے ملتان آیا، ستلج کا دریا گذرا، اور پھر بہاولپور کا شہر آیا، اسٹیشن پر افسران و متعلقانِ تعلیم موجود تھے عباس منزل میں جو سرکاری مہمان خانہ ہے قیام ہوا۔

بہاولپور میں انگریزی کا ایک کالج صادق ایجرٹن کالج ہے، اور دوسرا عربی کا سرکاری مدرسہ **جامعۂ عباسیہ** ہے جو ۱۹۲۵ء سے چل رہا ہے، اس مدرسہ کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس کا نصابِ تعلیم ندوۃ العلماء کے اصول پر بنایا گیا ہے یعنی معقولات کا بڑا حصہ خارج کر دیا گیا ہے، قرآن پاک کے علوم بڑھا دیئے گئے ہیں، اور میٹرک تک انگریزی کا بھی اضافہ ہے،

موجودہ وزیر تعلیم عالی مرتبت میجر شمس الدین محمد صاحب نے جب سے محکمۂ تعلیم کی عنان اپنے ہاتھ میں لی ہے، تعلیم کی اصلاح کے مسئلہ پر خاص توجہ مبذول فرمائی ہے، اسی سلسلہ میں جامعۂ عباسیہ کی اصلاح کا خیال بھی ان کے سامنے تھا،

اور اس کے لئے میری یاد فرمائی ایک سال سے جاری تھی، اس کا موقع اس سفر میں اس طرح پیش آیا کہ ۱۴ر مارچ کو صادق ایجرٹن کالج میں خطبۂ اسناد (کانووکیشن ایڈریس) کے لئے بلایا گیا، جس کو میں نے قبول کر لیا کہ "یک کرشمہ دو کار" تھا،

عباس منزل پہنچ کر رات کو ۱۱ بجے تک خطبہ تیار کیا، ۱۴ر کو گیارہ بجے دن کو صادق لائبریری ہال میں عطائے اسناد کا جلسہ تھا، اکثر وزراء، حکام، عمائد، اساتذہ اور تلامذہ موجود تھے، مسٹر اینڈرسن ریونیو منسٹر صدر جلسہ تھے، عطائے اسناد کے بعد میں نے اردو میں اپنا خطبہ پڑھا، جو اپریل کے **الندوہ** لکھنؤ میں شائع ہو گیا ہے، اس خطبہ کا ایک فقرہ عام طور پر زبانوں پر رہ گیا،

"تعلیم کا صحیح مقصد انسان کو تبانا نہیں، انسان کو بنانا ہے"

دوسرے دن رات کو میری تقریر کے لئے اسی ہال میں ایک اور عظیم الشان جلسہ ہوا، جس میں علماء، حکام، معززین، کالج کے پروفیسر اور طلبہ شریک تھے، تقریر کا موضوع "خصائص اسلامی" تھا، ڈیڑھ گھنٹہ میں یہ تقریر ختم ہوئی، اور ایسا نظر آتا تھا کہ یہ دلوں میں گھر کر رہی ہے، مگر آجکل کی تقریروں کی تاثیر ہی کیا؟ اس کی اصلیت انسانی گراموفون سے زیادہ نہیں، اور ان کا ماحصل ایک "واہ" کے سوا کچھ اور نہیں،

جمعہ کے دن جامع مسجد میں فضائل نبوی پر ایک وعظ ہوا، جس میں مسلمانوں

کو اس نسبت نبوئی کے شرف کی بنا پر اشرف الامم تا کر ان کو خیر الامم بننے کا شوق دلایا گیا، اور اولاد کو اسی رنگ میں تعلیم دینے کا مشورہ دیا گیا، ہم کو تو مسلمانوں کی مرعوبیت دیکھ کر یہ ڈر لگنے لگا ہے کہ وہ اپنی خیر الامی کے عقیدہ کو جو ان کے جسم کا خون ہے، کہیں دلوں سے نکال نہ بیٹھیں، جس کے بعد ان کو ہندوستان کے میدان سے شکست دے دینا ہر ایک کے لئے آسان ہو جائے گا،

وسط جولائی تک اڈیٹر معارف کا قیام دار المصنفین سے باہر رہے گا، اس لئے اس درمیان میں ذاتی خطوط کے علاوہ معارف سے متعلق اور دوسری دفتری خط و کتابت براہِ راست دفتر دار المصنفین سے کی جائے، تاکہ خطوط کے جواب میں تاخیر نہ ہو،

مقالات

مولانا سید سلیمان ندوی
کا
پہلا کارنامہ

از مولانا مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی

(۵)

بعض مذاہب سے موازنہ

جیسا کہ میں نے عرض کیا، ساری کتاب ہی ان مقدمات کی تشریح و تفصیل ہے لیکن شروع میں آپ نے دنیا کے دو مشہور مذہب جو دوسرے بھولے بسرے غیر تاریخی دیانات و ملل کے مقابلہ میں ایک حد تک مذہب کہے جانے کے مستحق ہیں، یعنی یہودیت اور عیسائیت سے کلیاتی نوعیت کا ایک "موازنہ" پیش فرمایا ہے، ممکن ہے کہ سید صاحب کی نگاہ میں اہمیت نہ ہو، لیکن میرے نزدیک اگر اس کتاب میں کسی چیز کی کمی رہ گئی ہے، وہ یہی ہے، کہ خواہ کچھ بھی ہو جب یہودیت اور عیسائیت کے سوا، دنیا میں ایسے مذاہب بھی موجود ہیں، جن کے ماننے والوں کی کافی تعداد ہے، بلکہ بعضوں کی تو عیسائیت و یہودیت کے قریب قریب یا شاید زائد بھی ہو ان کا تذکرہ کرنا بھی قرین مصلحت اور اتمام حجت کے لئے اتنا غیر ضروری نہ تھا جیسا کہ سید صاحب نے روا رکھا ہے، خصوصاً جس ملک اور جس زبان میں یہ کتاب پہلی دفعہ پیش ہوئی ہے اس سے یہودیوں

اور عیسائیون کا اتنا وسیع اور گہرا تعلق بھی نہین ہے، جتنا کہ ان مذاہب کے پیروؤن کا ہے، ممکن ہو کہ میرے معروضہ کو شرفِ پذیرائی عطا فرمایا جائے، اور آیندہ اڈیشنون مین دار المصنفین جو ہر طرح اس کام کی تکمیل کے سامانون سے معمور ہے، اسکی طرف سے اس کی تلافی ہو جائے گی، اس مخلصانہ مشورہ کے پیش کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے، کہ ہندوستان مین اسلام کی جانب سے مذہبی کاروبار کرنے والون کو زیادہ سابقہ بہ نسبت عیسائیون اور یہودیون کے ان ہی قومون سے پڑتا ہے، اور پڑنا بھی چاہئے، حال یہ ہے کہ صحیح و مستند مواد کے نہ رہنے کی وجہ سے عموماً دیکھا جاتا ہے، کہ ہمارے عام علماء وارباب مناظرہ یا مبلغین (اگرچہ یہ صرف لفظ ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ اس کو حقیقی معنی کب اور کس کے ذریعہ سے میسر آئے گا) ان ہی بے سروپا باتون سے کام لیتے ہین، جو غیر مستند متعصب پادریون کی پھیلائی ہوئی ہین جنھین بقول اپنے، اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہین آتا، لیکن دوسرون کی آنکھون کا تنکا بشکل شہتیر نظر آتا ہے، یا ان پیشہ ور ارباب جدل و مراء کے متہمانہ الزامات ہین، جو دوسرون کے مذاہب سے اسی طرح ناواقف ہوتے ہین جس طرح خود اپنے مذہب اور اسلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے،

حالات کا تقاضا ہے، اور تقاضا شدید سے شدید تر صورت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے، کہ اب تغافل کیشی و سردمہری کے طریقہ کو چھوڑ کر اس راہ مین بھی سچا قدم اٹھایا جائے، سنجیدہ و ذمہ دار ہستیان اب اس مہم کی کمان اپنے ہاتھون مین لین، وقت گذر گیا، جب یہ اقوام ہالکہ (جن کی رجعت کا ایک وقت مقرر تھا) اور ان کے مردہ ادیان و مذاہب تردیداً بھی قابلِ ذکر نہین خیال کئے جاتے تھے، وان ارید الا الاصلاح ما استطعت۔

بہرحال پھر بھی سید صاحب نے اگر باطل کی تمام شکلون کا احاطہ نہین فرمایا ہے، تو حق کی مکمل تصویر کشی مین بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہین فرمایا، اسلام کی کاملیت کو اتنے دل آویز روح پرور انداز مین نمایان فرمایا گیا ہے، اور اس کے ایک ایک خط و خال مین اپنی متین دل موہ لینے والی تعبیرون سے ایسے دیدہ زیب

نظر فریب رنگ بھرے گئے ہین، کہ مسلمان تو مسلمان ایک غیر مسلم کے سامنے بھی اگر کچھ بھی وہ ضمیر کی زندگی کا سرمایہ دار ہے، یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ جب دنیا مین سو کی تقسیم ہو رہی ہے، تو بلا وجہ دس ہی کے لینے پر کسی چھوٹی اور جھوٹی غرض کے تحت کیون اصرار کیا جائے، یقیناً وہ ننگا مجنون ہے، جسے قمیص کے ساتھ پائجامہ بھی بلا کسی معاوضہ اور مشقت کے دیا جا رہا ہے، لیکن وہ صرف قمیص ہی کے پہننے پر اسلئے ضد کر رہا ہے، کہ یہ میرے باپ دادون کا تبرک ہے،

یہ بحث اتنی مبسوط اور مفصل ہے کہ ایک تعارفی مقالہ مین اس کے نقل کرنے کی قطعاً گنجائش نہین ہے، تاہم مباحث کی نوعیت کے سرسری اندازہ کے لئے مثالاً چند چیزین پیش کی جاتی ہین،

تعلیمات و مسائل میں جزئیات کا احاطہ

ایک ایک مسئلہ کے متعلق اسلام مین جزئیات کا کتنا احاطہ کیا گیا ہے، اس سلسلہ مین دوسری مثالون کے ساتھ سید صاحب نے اس مسئلہ کا بھی ذکر کیا ہے، جس کی طرف ہزار ہا ہزار سال بعد بلکہ شاید پہلی دفعہ ہمارے ملک مین حکومت کی توجہ کا بھی آغاز ہوا ہے، یعنی "حرمت شراب" کے مسئلہ کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہین،:-

"مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہین کیا ہے، مگر اچھا کسی نے نہین سمجھا اسلام پہلا مذہب ہے جس نے تذبذب اور شک ہان نہین، کے تمام پہلوؤن کو دور کر کے اس بارہ مین قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کردیا"۔

لیکن بس صرف قطعی فیصلہ کے نفاذ پر بات ختم ہوگئی، ؟ اگر اسلام بھی یہی کرتا، اگرچہ اس سے پہلے کسی نے اتنا بھی نہین کیا تھا، تو اسکی یہ خصوصیت اور اس کے متعلق یہ دعوی کہ برائی کے گھسنے اور در آنے کے چھوٹے سے چھوٹے سوراخ، بلکہ مسامات جو ممکن التصور ہوسکتے ہین، ان کے بند کرنے مین وہ کامیاب ہوا ہے، کیا درست ہوسکتا تھا، سید صاحب فرماتے ہین،

ایک شخص شراب نہیں پیتا، لیکن اسکی تجارت کرتا ہے، ایک شخص ان دونون چیزون سے احتراز

کرتا ہے، لیکن ان برتنوں کو استعمال میں لاتا ہے، جن میں شراب رکھی جاتی ہے"۔

یہ رائیں اگر کھلی رہتیں، تو تاریخ میں "انسداد مسکرات" اور "ام الخبائث کے بانجھ کرنے میں اسلام کو جو کامیابی ہوئی، کیا ہو سکتی تھی، خصوصاً جب کہ دیکھا جاتا ہے کہ حکومتوں نے اس کا بیڑا اٹھایا لیکن بالآخر ان کو اپنی شکست فاش کا اعتراف کرکے "امتناع شراب" سے ہاتھ اور خود شراب سے منہ دھونے پر مجبور ہونا پڑا، کیا آج امریکہ میں "انسداد شراب نوشی" کے مزار پر صراحی و مینا کے دور زور شور سے جاری نہیں، کبھی کبھی اس مرحوم کی یاد میں بھی شراب ہی کا کوئی جام نوش کر لیا جاتا ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا کہ سید صاحب لکھتے ہیں، یہ فرماکر کہ

"خدا لعنت کرتا ہے شراب پر، اس کے پینے والے پر، اوس کے پلانے والے پر، اس کے بیچنے والے پر، اس کے خریدنے والے پر اس کے نچوڑنے والے پر، اپنے لئے نچوڑنے والے پر، اسکے لیجانے والے پر، اور اس پر جس کے لئے لے جائی جائے،

اور صرف یہی نہیں، بلکہ سید صاحب نے صحیح حدیثوں کی روشنی میں یہ دکھایا ہے کہ شراب کی مختلف قسموں جن جن چیزوں سے وہ بنتی ہیں، یہ اور ان کی مقداروں کی تعریف، تحدید، نتائج و آثار کی تنقیح و تفتیش جو آثار میں شراب کے ساتھ ادنیٰ مناسبت بھی رکھتی ہیں، ان کی حرمت کی تصریح، الغرض یہ اور ان ہی جیسے تمام متعلقہ امور کی کامل بصیرت اور پوری طاقت کے ساتھ احاطہ اسلام ہی کی وہ نکتہ نوازیاں ہیں، کہ بقول سید صاحب:۔

"کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہیں کرسکتا"

کسی قانون کے گوشہ گوشہ، کونہ کونہ پر اسلام کی نظر کتنی گہری پڑتی ہے، اور پھر کتنی صفائی کے ساتھ وہ احکام نافذ کرتا ہے، سید صاحب کی پیش کی ہوئی "حرمت شراب" کی مثال اس نقطۂ نظر کے سمجھانے کے لئے کافی ہے، اس سلسلہ میں اور چیزوں کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے، لیکن اس کیلئے

کتاب ہی کا دیکھنا مفید ہوگا، البتہ سید صاحب کی اس حکیمانہ نظر سے چاہئے کہ ان مطلق العنان ابجد پسند لاابالیوں میں چونک اور عبرت پیدا ہو، جو آئینی پابندیوں سے گھبراکر براہ راست قرآن اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تو جسارت نہیں کر سکتے، اسلئے شاعروں کی طرح، بجائے فلک ستم شعار کے مسکین مولویوں پر ناک اور بھوں چڑھاتے، اور دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں، اور اپنے استہزائی قہقہوں میں شریعت کے ان دقیق حقائق کو گم کردینا چاہتے ہیں، جو بیچارے مولویوں نے نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آفتاب نبوت کی روشنی میں نمایاں ہوئیں، اور دنیا کو ان ہی کے نفع کے لئے پابندی کی دعوت دیگئی ہے، کہ

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ	جو سیدھی راہ پر لگ گیا، تو خود اپنے لئے
وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا	لگا، اور جو بھٹک گیا، سو اپنے ہی کو ضرر
وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ	پہونچانے کے لئے بھٹکا، ایک کا بوجھ
اُخْرٰى ، (بنی اسرائیل - ۲)	دوسرا نہیں اوٹھاتا،

اسلام کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب کے اخلاق غیر فطری اور ناقابل عمل ہیں

اس بحث سے فارغ ہونے کے بعد اخلاق کے نرم و گرم بست و بلند مدارج کی تفصیل کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اس سلسلہ میں بھی سب سے پہلے "پیار اور محبت" کے ان مدعیوں ہی کے صلیبی مسلک کو سید صاحب نے اپنے آگے رکھا ہے جس میں فاعلانہ قوتوں کے مقابلہ میں انسان کے انفعالی اور انائی جذبات کو اوبھارنے کی کوشش کرکے گرم انسان کو سرد آدمی بنانے کا ارادہ کیا گیا تھا، مثلاً خودداری کے مقابلہ میں کسر نفسی کو، انتقام کے مقابلہ میں حلم و عفو و چشم پوشی اور درگذر کو، عزت نفس کے مقابلہ میں خاکساری او فروتنی کو، امارت و حکومت، سرداری و سربرآرائی کے مقابلہ میں غربت و مسکینی، فقر و فاقہ کو جاہ طلبی شہرت پسندی کے مقابلہ میں گمنامی و عزلت گزینی کو خوشحالی و خوشدلی کے مقابلہ میں غمگینی، افسردہ دلی

کو خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی عام فہم اصطلاح مین تشدد اور ہمسا کے مقابلہ مین عدم تشدد اور اہمسا کو سراہا گیا، اور اتنا سراہا گیا، کہ ان انفعالی و اناثی صفات کے مقابلہ مین تمام فاعلانہ جذبات کا شمار رذائل اور بدترین اخلاقی جرائم مین ہو گیا، اور اسی لئے جس طرح بدھ مت مین خواہش کو مٹا کر دل کی دنیا کو بالکلیہ اجاڑ دینے کا حکم دیا جاتا ہے، اسی طرح عیسائی مذہب مین سکھایا جاتا ہے، کہ مجاہدہ ریاضت کی مشقتون سے جس طرح ممکن ہو، اِن آمرانہ فاعلانہ صفات کا قلع قمع کر دیا جائے،

سید صاحب نے دریافت فرمایا ہے، کہ زبان سے کسی بات کا نکالدینا تو آسان ہے، لیکن کیا اس پر عمل بھی ممکن ہے، کل صفات ہون، یا صفات کا کوئی خاص شعبہ جب وہ فطری ہین جس قدرت نے انسان کو بنایا، اسی نے تو اس مین تمام جذبات و عواطف، رجحانات و میلانات کو ودیعت فرمایا ہے، پھر قدرت کا مقابلہ کون کر سکتا ہے، قدرتی قوانین سے کون لڑ سکتا ہے، آگ سے حرارت، نمک سے نمکینی اور کرنون سے روشنی کو کون چھین سکتا ہے، زیادہ سے زیادہ مصنوعی ریاضتون سے خود انکو نہین، بلکہ ان کے آثار کو دبایا جا سکتا ہے، سانپ مرتا نہین، بلکہ کینچلی کے غلاف مین تھوڑے عرصہ کے لئے بند ہو جاتا ہے سید صاحب فرماتے ہین،

"یہ کہنا بظاہر بہت خوشنما ہے، کہ ہر قسم کی ناراضی و ناخوشی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے، مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے، ناراضی و ناخوشی کو سرے سے فنا نہین کیا جا سکتا"،

دوسری جگہ لکھتے ہین، کہ یہ حکم

"غیظ و غضب اور ناراضی و نارضامندی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو، جو یقیناً ناممکن ہے"،

کتنا سخت، کتنا پیچیدہ و دشوار گذار مرحلہ ہے، اسی ناممکن کو ممکن بنانے کے لئے بدھ مت کے

بھکشوون جین مت کے سادھوؤن عیسائی مذہب کے راہبون کو کیا کچھ نہین کرنا پڑا، گھر چھوڑا، در چھوڑا، دنیا کے سارے تعلقات کو ترک کر کے جنگلون مین بسیرا لینا پڑا، کسی نے ہاتھون کو سکھایا، کسی نے ٹانگین خشک کین، سانس روک روک کر برسون غارون مین پڑے رہے، اور آج بھی جو واقعی اپنے مذہب کے حکم کی تعمیل مین مخلص ہوتے ہین، وہ صرف اسی سعی لاحاصل مین کیا کچھ نہین کر رہے ہین،

اسلامی تعلیمات کی ایک خصوصیت

اسلام نے انسانی فطرت کی اس اخلاقی پیچیدگی کا کیا حل پیش کیا ہے قبل اسکے کہ اسکا ذکر کیا جائے سید صاحب کی زبانی اسلامی تعلیمات کی ایک اور خصوصیت سُن لیجئے، فرماتے ہین کہ کوئی شخص مسلمان ہو یا نامسلمان، مومن ہو یا کافر، متقی و پارسا ہو یا فاجر و فاسق، مہذب و شائستہ ہو یا جاہل گنوار کوئی بھی ہو، اسلام کہتا ہے کہ

"شخص کی شخص کی حیثیت سے بے زاری نہ ہو، بلکہ دراصل اوس کے افعال و اعمال و اخلاق سے مخالفت یا بے زاری ہو"،

اور اسکی وجہ کیا ہے سید صاحب فرماتے ہین:-

"کیونکہ اسلام مین شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت و کراہت کا وجود نہین نہ ہندوؤن کی نظر مین کوئی قابلِ نفرت اچھوت ہے، نہ ملچھ نہ چنڈال، نہ یہودیون کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے، اور نہ غیر قوم ہے، نہ مجوس کی طرح کوئی پاک نژاد اور بدگہر کی تفریق ہے، اور نہ عیسائیون کی طرح کوئی کالے گورے یوروپین غیر یوروپین کی تقسیم ہے جو کچھ ہے، وہ کفر و ایمان اور شرک و توحید کا فرق ہے، ایک خالص عرب اور قریش کافر ہو کر ابو جہل اور ابو لہب ہو سکتا ہے، اور ایک معمولی حبشی عجمی، مومن موحد ہو کر بلال حبشی صہیب رومی سلمان فارسی کا رتبہ پا سکتا ہے"،

خلاصہ یہ ہے کہ عداوت ہو یا نفرت، مخالفت ہو یا معاندت اسلام کی اخلاقی فہرست مین

ان صفات میں سے کسی کا تعلق قطعاً کسی کی ذات سے نہیں ہے، اس مسئلہ کو سمجھ لینے کے بعد صرف ایک بات یعنی وہی نصب العین کا اساسی اصول جس کے صحیح نہ ہونے سے بُرے اعمال ہی نہیں بلکہ اچھے سے اچھا نیک کام بھی بدترین کام بن جاتا ہے، نماز جیسی عبادت تک دوزخ کی کلید کی شکل اختیار کرلیتی ہے، صرف اس نصب العین کو بدل دینے یعنی بجائے کسی مخلوق کے اپنی زندگی اور زندگی کی ساری سرگرمیوں کو خالق کے لئے قرار دینے کے بعد سید صاحب فرماتے ہیں، کہ وہ سارے صفات جن کی وجہ سے بدھ مت میں انسان کو صفات سے ہی معرا کرنے کی کوشش کیجاتی ہے، اور عیسائیت میں گرم آدمی کو انسان سرد اور صرف برف کا تودہ بن جانے کا حکم دیا جاتا ہے، اسلام کہتا ہے، کہ ان کے مٹانے کی نہیں بلکہ صرف

"ان جذبات کا صحیح موقع و محل متعین کیا جائے،"

اور وہ محل و موقع کیا ہے، ذات نہیں، بلکہ جن صفات کی وجہ سے ایک قریشی ابوجہل اور ایک ہاشمی ابولہب بن جاتا ہے،

نصب العین کی تصحیح کے بعد محض ان صفات سے نجات دے کر اس کا موقع دیا جائے، کہ ایک حبشی غلام بھی بلال، اور ایک رومی لوہار بھی صہیب اور رسول کے قتل کے لئے گھر سے نکلنے والا عمر بن الخطاب، مسلمانوں کا خلیفہ فاروق اعظم کے مقام تک پہونچ جائے، سید صاحب فرماتے ہیں، کہ اخلاقی زندگی کا یہی وہ راز ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کو جہاں

"رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ (آپس میں ایک دوسرے پر مہربان) اور اَذِلَّۃٍ عَلَی المُؤمِنِینَ (مومنوں کے فرمان بردار بننے کی تعلیم دی ہے،"

وہیں ان صفات کو جن کے درپے ہو کر بقول نطشے

"مسیحیت نے ہمیشہ کم زور پست و بوسیدہ اشیاء کا ساتھ دیا، ...... اور مسیحیت نے

زبردست داغوں کا ستیاناس کر دیا۔"

قرآن نے مسلمانوں کو

اَشِدَّاءُ عَلَی الکُفَّارِ ، کافروں پر بھاری،

اور

اَعِزَّۃٍ عَلَی الکَافِرِینَ ، کافروں پر گراں بننے کی تعلیم دی،

اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ

"وہی عکرمہ (ابن ابی جہل)، خالد (ابن ولید) بہ یک نظر ان کی وہ کایا پلٹ ہوئی، کہ وہ مسلمانوں کے سرگروہ ہوگئے، اور مسلمان ان کے فدائی بن گئے،"

اصلاح نفس کا صحیح طریقہ

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے جن فطری صفات کے متعلق دنیا کے اخلاقی اور مذہبی دائروں میں ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے کہیں ان کے علاج کے لئے کھانا چھوڑ دینے کا حکم دیا جاتا ہے، کہیں پانی سے روکا جاتا ہے، کہیں سانس روکی جاتی ہے، کہیں زبان اینٹھی جاتی ہے کہیں ٹانگ سکھائی جاتی ہے، اور کہیں تو العیاذ باللہ غریب انسان خصی[۱] بنایا جاتا ہے، وام مارگی اور مانگ دیا تک مسکوں کا رواج ان ہی صفات کی بدولت ہوا، مگر اسلام نے صرف ایک فقرہ کی برقی رو سے کر ان

۱؎ ایران کے فرقہ مانویہ کے متعلق مشہور ہے، کہ وہ ہاتھوں میں استرے لئے پھرتے تھے، تاکہ دنیا کے شر کی جڑ ہی کو ختم کر دیا جائے، اور جینی فرقوں کے بھگتوں کے مجسمے تو آج بھی باغ عامہ کے میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ کسی زمانہ میں نفسیاتی خواہشوں کا علاج یہ کیا جاتا تھا، کہ آدمی خصی بنا دیا جائے، ڈگر فرقہ کے فقرا، اب بھی جینیوں میں ان کی یادگار ہیں، جو ننگے رہتے ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ نفس کشی کی یہ ترکیب بھی ہے کہ نجاستوں کو مقا جائے، اگھوڑی کسی زمانہ میں مہاتما سمجھے جاتے تھے،

صفات کے ازالہ کی نہین، بلکہ صرف امالہ کی ضرورت ہے"، (حضرت حاجی امداد اللہؒ) پہاڑ کو پانی کا

اکی مثال | گویا یون سمجھنا چاہئے کہ ایک سیلاب ہے، جو کسی آبادی کو دھمکیان دیتا سینہ تانے آگے بڑھا چلا آرہا ہے، بستی والے حیران تھے، کہ اس تباہی سے بچنے کی کیا راہ نکالی جائے، کوئی پشتون کی رائے دے رہا تھا، کوئی لوگون کو بھیج رہا تھا کہ اس کے اصلی دہانے کا پتہ چلائین، اور وہین ممکن ہو تو ڈاٹ لگا دی جائے ابھی یہ لوگ انہی فکرون میں تھے، کہ ہاتھ مین سبل لئے ہوئے ایک شخص آتا ہے، اور تاک کر ایک ایسی جگہ پر مارتا ہے، جہان سے پانی اپنا رُخ موڑ کر بجائے آبادی کے سیدھے دندناتا ہوا ان بنجر اور افتادہ زمینون کی طرف بھیل جاتا ہے، جو صدیون سے پانی کے ایک ایک قطرہ کیلئے پیاسی تھین، پھر وہین جہان اُڑتی ہوئی گرد اور دھول کے سوا کچھ نہین تھا، لہلہاتے ہوئے چمن، اور ہری بھری کھیتیان نگاہون مین نور، اور دل مین سرور کی موجون مین تلاطم پیدا کرتی ہین، وہی پانی جو ابھی جانون اور مالون کے لئے خطرہ بنا ہوا تھا، دولت کا خزانہ اور مسرت کا دفینہ بن گیا،

رذائل کے صحیح استعمال | پھر اگر اسی طرح انسان کی فطرت سے بغض کے جذبات، عداوت کی لہرین، انتقام کے شعلے، حسد کی چنگاریان نکلتی ہین، تو بجائے نیکون کے تم شریرون کی طرف نہین، بلکہ اون کی شرارتون کی طرف کیون نہین ان کا رُخ کر دیتے ہو تاکہ وہ بھی شر سے نجات پا کر خیر کے سرچشمہ تک پہونچ جائین، بغض یقیناً بُری صفت ہے، لیکن کیا ڈاکوؤن کے لئے بھی غصہ بُرا جذبہ ہے، لیکن کیا چورون کے لئے بھی، حسد بُری خصلت ہی، لیکن کیا ان سود خوار مہاجنون کے ساتھ بھی، جن کا روپیہ بجائے غریبون کی امداد کے صرف ان کی غربت مین غربت کے اضافہ کا ذریعہ بنا ہوا ہے، بخل بد ترین خلق ہے، لیکن کیا ان آوارہ گرد بچّون کے لئے بھی جو اسکول اور کالج کی کتابون کو بھی بیچ کر سینماؤن اور تھیٹرون مین اپنے ماں باپ کی گاڑھی کمائی کو بے دردی

کے ساتھ خرچ کرتے ہین، اور یہ بد ترین جذبات ہین، جب ان کا یہ حال ہے، کہ اپنے صحیح مواقع استعمال کے وقت صرف جائز ہی نہین بلکہ واجب ہو جاتے ہین، تو اوسی پر دوسرون کو قیاس کرنا چاہئے

اسلامی اخلاق کے شاعر شارح سعدیؔ نے ان دو مصرعون مین اسلام کے اس نظریہ کا کتنا اچھا خلاصہ پیش کیا ہے، فرماتے ہین:۔

ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن

نگفتم کہ دیوار مسجد شکن

اب لکڑی کی جگہ، کوئی اپنے تیشہ کو مسجد کی دیوارون پر چلا رہا ہے، تو یہ اس کا قصور نہین ہے جس نے اسے تیشہ دیا تھا، اور کچھ ان ہی صفات کے ساتھ نہین، بلکہ سید صاحب کا تو خیال ہے، کہ اسلام کے چند بلند ترین قیمتی نظریات یعنی، صبر و توکل تسلیم و رضا تقدیر قناعت اجمال طلبی وغیرہ محض اپنی استعمالی غلطی سے آج دشمنون کے طعن و تشناعت کا مورد بنے ہوئے ہین ورنہ یہ تعلیمات

" اسی لئے ہین کہ مسلمانون مین حوصلہ مندی، پر امیدی، استقلال، اور ثبات قدم پیدا ہو، مسلمانون مین سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہئے، پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ خدا پر بھروسہ اور توکل کر کے کام شروع کر دینا چاہئے، اگر کام مین کامیابی ہوئی، تو فخر و غرور کے بجائے دل سے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے، اور یہ سمجھنا چاہئے، کہ یہ اسی کے فضل و کرم سے ہوا، اور اگر ناکامی ہوئی، تو دل مین یاس و ناامیدی کے بجائے صبر و ثبات پیدا ہونا چاہئے، اور سمجھنا چاہئے، کہ خدا کا منشا یہی تھا، یہی تقدیر ہے"،

قرآن کی روشنی مین اس مسئلہ کو سمجھاتے ہوئے آخر مین فرماتے ہین،

"اسی تعلیم کا اثر تھا، کہ صحابہؓ نے تمام خطرات سے نڈر ہو کر بڑی بڑی سلطنتون اور فوجون کا مقابلہ کیا، اور کامیاب رہے"۔

عام انسانون کے ساتھ مسلمانون کے فرائض،

بہرحال انسان کے جن صفات کو رذائل، تشدد وغیرہ کے نام سے بدنام کیا گیا ہے، اسلام ان سے "انسانی آبادیون" کی اس خس وخاشاک اور جنگلی جھاڑون کے صاف کرنے کا کام لیتا ہے، جن سے انسانیت کی فطری نشو ونما بالیدگی اور سرسبزی وتازگی مین رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، اور اسی لئے سید صاحب فرماتے ہین، کہ کسی قسم کا کوئی انسان کیون نہ ہو، اس سے اسلام بلاوجہ کنارہ کش اور الگ تھلگ رہنے کا حکم نہین دیتا، بلکہ الگ رہنا کیا معنی مسلمانون پر جہان یہ فرض ہے، کہ اپنی قوم کی امداد واعانت کرین، اسی کے ساتھ ان پر غیر مسلم قومون کے متعلق ایک خاص فرض سپرد کیا گیا ہے، کہ نیکی کی جو راہین انھین ملی ہین، اور خدا کے جس تعلیمی آب حیات سے خود زندہ ہوئے ہین، کوشش کرین کہ دوسری قومین بھی جو اس زندگی سے محروم ہین، ان کو بھی اس سے حصہ ملے، اس راہ مین مسلمانون کو الگ رہنا تو بڑی بات ہے، یہان تک حکم دیا گیا ہے، کہ اگر دوسرون کے زندہ کرنے کی کوششون مین انھین خود مرنا پڑے تو مرجائین، یہی اسلام کا قانون جہاد ہے، جس کے لفظی معنی تک سے اغماض برت کر، اس کو عام جنگون پر قیاس کرکے یہ مغالطہ پھیلایا گیا ہے، کہ جہاد بھی جنگ کا عربی ترجمہ ہے، اپنے کو اپنی قوم کو اسکی دولت وعزت کو بڑھانے اور باقی رکھنے کے لئے دوسرون کو فنا کرنا کتنا بڑا ظلم کیا گیا ہے، جب اس جنگ کو جسکی یہی غرض ہوتی ہے، اور اسی لئے انسانون کی ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیون کے نگل جانے کے قدرتی حق کا اپنے کو حقدار خیال کرتی ہے، اس جہاد کا قائم مقام ٹھہرایا گیا ہے، جس مین اگر دوسرون کے زندہ کرنے اور خدا کے کلمہ کو دلون کی ان زمینون سے آگے بڑھا کر جہان اس کا پرچم لہرا چکا ہے، ان قلوب پر بھی بلند کرنے کا مقصد سامنے نہ ہو، تو معاذ جہاد کے بلند مقام سے گر کر صرف شرمناک جنگی خونریزی بن جاتا ہے،

بہرحال غیر قومون کے ساتھ مسلمانون کا جو صحیح تعلق ہے، وہ تو یہی ہے، لیکن جیسا کہ

سید صاحب نے فرمایا ہے کہ ایسے مواقع پر جہان دوسرون کو نیک بنانا تو الگ رہا، خود مسلمانون کے بدبن جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہو، تو حکم دیا گیا ہے، کہ اس وقت ان سے الگ رہین،

دوسرے مذاہب کا غیر معتدل طریقہ

سید صاحب نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے کہ یہ تو ایسی بات ہے کہ جس مذہب مین حکم دیا گیا ہے کہ شریرون کو شرارت سے صرف نہ روکو، بلکہ ان کے آگے شرارت کا میدان میدان پیش کر دو، یعنی وہی ایک گال پر تھپڑ مارنے والے کے آگے دوسرے رخسارے کا بھی تحفہ پیش کرنا چاہئے، اور جیسا کہ جینیون کے متعلق سنا جاتا ہے کہ ان کے یہان صرف یہی نہین کہ سانپون اور بچھوؤن کا مارنا حرام ہے، بلکہ حکم دیا گیا ہے کہ دودھ پلا پلا کر ان کو زندہ کیا جائے، اور ان کے توالد وتناسل مین اتنی کوشش کیجائے، کہ خدا کی زمین کا چپہ چپہ سانپون اور سنپولون بچھوؤن، اور بچھولون سے بھر جائے، بہر کیف جس مذہب کا ایسا روحانی بلند مذاق ہے، اسی مسیحیت کے امام اعظم سینٹ پال صاحب ارشاد فرماتے ہین، قرنتیون والوں کو خط مین لکھتے ہین

"اگر کوئی بھائی کہلاکے حرام کار یا لالچی یا بت پرست یا گالی دینے والا، یا شرابی، یا لٹیرا، ہو، تو اس سے صحبت نہ رکھنا، بلکہ ایسے کیساتھ کھانا تک نہ کھانا۔"

آگے چل کر اور اضافہ فرماتے ہین :-

"اور تم بے ایمانون کے ساتھ نالائق جوئے مین مت جتے جاؤ، کہ راستی وناراستی مین کون سا ساجھا ہے، اور روشنی اور تاریکی مین کونسا میل ہے، ایماندار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصہ ہے،......

اس کے بعد خدا کا حکم سناتے ہین :-

"اس واسطے خدا کہتا ہے کہ تم ان کے درمیان سے نکل آؤ، اور جدا ہو، اور ناپاک کو مت چھوؤ"،

غیر قومون کے ساتھ اسلام کا طرزِ عمل اور اوس کا اصول

غور کرنے کا مقام ہے کہ گاں پیش کرنے والے مذہب کے اس حکم کے مقابلہ مین قرآن کا یہ حکم کہ

طَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَهُمْ، (مائدہ-۱)

جنھین کتاب دی گئی ہے، ان کے کھانے تمھارے لئے حلال ہین، اور تمھارے کھانے ان کیلئے حلال،

اور عام مسلمانون کا یہ مشرب کہ انسان خواہ وہ کسی دین و ملت کا ہو، نجس نہین ہوتا، کہ وہ کتا ہے، اور نہ سور، بلکہ ایک ہی باپ کے ہم سب بچے ہین، اور اسی بنیاد پر آیت قرآنی

إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ مشرکین نجس ہین،

کا مطلب یہ لیا گیا ہے، کہ ان مین صفاتی اور باطنی نجاست ہے، نہ کہ ذاتی اور وجودی لیکن پھر بھی ان ہی مسلمانون پر فینیٹزم مذہبی جنون کا الزام تھوپا جاتا ہے، اور لامذہبیت کے بد ترین جنون ہی پاگل ہو کر تھوپا جاتا ہے، سید صاحب نے یہ لکھکر کہ محض اس انفکشن (چھوت لگ جانے کے) خیال سے اسلام نے اگر مسلمانون کو کچھ احکام بھی دیئے ہین، تو وہ یہ نہین ہو کہ غیر مسلم سورون اور کتون سے بھی بدتر ہین کہ شاید سورون کا پیا ہوا آب تو ناپاک نہین ہوتا لیکن بعضون کے یہان مسلمانون کی صرف چھوئی ہوئی ندی ناپاک ہو جاتی ہے، خشک برتن تک مین نجاست پیدا ہو جاتی ہے، بلکہ ان کے جسم کا وہ سایہ جو صرف روشنی کے غائب ہونے کا نام ہے، اس سے بھی غسلِ جنابت کی ضرورت ہو جاتی ہے، ان ہی لوگون یا ان جیسون کے متعلق بھی اسلام مسلمانون کو یہ حکم دیتا ہے،

"دنیاوی معاملات اور اخلاق مین مسلمانون کو ان سے عدل و انصاف رواداری کی تاکید کرتا ہے"،

آگے آپنے اس قرآنی آیت سے جس مین حکم ہے، کہ "اگر مین لڑائی کے وقت کوئی مشرک

تم سے پناہ مانگے، تو اسے پناہ دو" کو درج کرنے کے بعد ارقام فرماتے ہین،

"قرآن مین یہ صریح حکم ہے، کہ اگر کسی مسلمان کے مان باپ مشرک و کافر ہون تو بھی ان کی خدمت بجالانا اور دنیاوی معاملات مین ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا ان کی مسلمان اولاد پر فرض ہی"،

اس سلسلہ مین سید صاحب نے ایک قرآنی لفظ اشداء کے عام مشہور ترجمہ کی تصحیح بھی کی ہے یعنی بجائے سخت کے اس کا ترجمہ گران" فرمایا ہے، چونکہ جن لغوی سندون کو آپ نے پیش فرمایا ہے، ان سے آپ ہی کے ترجمہ کی تائید ہوتی ہے، ورنہ اسلام کے ان صاف و صریح احکام کے بعد اگر اس کا ترجمہ سخت بھی کیا جائے تو شاید کچھ حرج نہ تھا، البتہ "اَذِلّۃ" کا ترجمہ "فرمانبردار" یہ سید صاحب کے خاص ادبی مذاق کا نتیجہ ہے، اور "ذلول" کی صفت اونٹون کی جو آئی ہے قرآن مین زمین کی توصیف مین یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے، بہت برمحل اور صحیح ہے، اسلام اردو والے "ذلیل" ہونے کی اجازت تو کسی مسلمان کو کسی وقت بھی نہین دیتا،

فاعلانہ اوصاف اوران کا صحیح استعمال انسانی ترقی کیلئے ضروری ہے

یہ ایک ذیلی بات تھی لیکن ضروری اور دلچسپ تھی، اس مین ذرا طول ہو گیا، اب پھر اصل صفات کے مسئلہ کی طرف رجوع ہوتا ہون،

سید صاحب نے تصحیح استعمال کے نظریہ کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے مطلب یہ ہے، کہ صرف یہی نہین، کہ جن صفات کو برائی کیساتھ مشہور کیا گیا، ہے، وہ اپنے صحیح استعمال سے درست ہی نہین، بلکہ قیمتی ہو جاتے ہین، سید صاحب فرماتے ہین، کہ یون بھی اگر دیکھا جائے تو انفعالی جذبات کے ساتھ اگر آدمی مین فاعلانہ رجحانات و میلانات نہ ہوتے، مثلاً عفو کے ساتھ انعام، محبت کے ساتھ عداوت، فروتنی و خاکساری کے ساتھ خودداری، یعنی مختصر لفظون مین عدم تشدد اہنسا کے ساتھ تشدد اور ہنسا کی آمیزش انسانی فطرت مین نہ کیجاتی، اور ایک کو دوسرے مین سمو یا نہ جاتا

تو جو دنیا آج نظر آرہی ہے، نظر نہ آتی ؟

سید صاحب نے یہ قرار دیا کہ تمام فاعلی جذبات کی انتہا، در اصل قوت غضبیہ اور قوت شہوانیہ یعنی، انتقام اور خواہش پر ہوتی ہے فرماتے ہین :-

"دنیا مین علم و ہنر، خوشی و مسرت، ولولہ و انبساط، رونق و ترقی، جد و جہد جو کچھ ہے، وہ ان ہی فاعلانہ قوتون کی جلوہ آرائیان ہین، اگر یہ دونون قوتین ایک قلم مٹ جائین، یا ان مین افراط و تفریط پیدا ہو جائے، تو نیکی و سعادت، خوش بختی کی آدھی دنیا مرجائے، نہ عفت کا کوئی مفہوم ہو، نہ عصمت کے کوئی معنی ہون، نہ عدل کا وجود ہو، نہ امن کا نشان ملے نہ کسی کی جان سلامت رہے، نہ انسان کی بلند ہمتی اور استقلال، ثبات قدمی اور سعی و محنت کے جوہر نمایان ہون"۔

اور آخر مین اس واقعی حقیقت کو اس فقرہ پر ختم کرتے ہیں :-

"قومون کی ترقی، ملکون کا نظام درہم برہم ہو جائے، اور خدا کی دنیا ایک ویرانہ بن جائے جسمین حرکت و جنبش کا نام نہ رہے"؛

"عدم تشدد" کے اس دور مین جب مجرم قیدیون کے لئے برقی پنکھے اور مسہریون کے پردے، خشک و تر میوے مہیا کئے جارہے ہین، اولٹین اور چاء سے ان کی ضیافت کی جاتی ہے، خدا جانے سید صاحب کے اس بیان کو کس سیارہ کا قانون یا تاریخی نظریہ قرار دیا جائے گا،

بہرحال دوسرون کا کچھ ہی خیال کیون نہ ہو، سید صاحب کا دعوی ہے کہ اسلام کی اسی مجموعی تعلیم کا یہ نتیجہ ہے، کہ

"اسکی تعلیم پر دس سال کی بھی مدت نہین گذری تھی، کہ محکومون نے حاکمون کی، پست نے بلند کی، ادنی نے اعلی کی منزل نے ترقی کی جگہ حاصل کرلی"۔

آیندہ متوقع وہمی امیدون سے کیا یہ گذرے ہوئے واقعات جھٹلائے جاسکتے ہین، اور دس سال والا یہ انقلاب وہ نہین تھا جن کے دور مین "پاپ" خوش ہین، بلکہ چنگیزی و تیموری، یاجوجی ماجوجی برقی انقلابات سے اس کا امتیاز یہی ہے، کہ اس عہد مین "پن" مگن تھے،

ایک یورپین مورخ کا اعتراف

اور صرف وہی انقلاب نہین، بلکہ بنیاؤن کا تو خیال ہے کہ اس کے بعد دنیا مین جہان کہین جو کچھ بھی ہوا، اسی حرکت کے توجات سے ان کی لہرین اٹھی ہین، سید صاحب نے مشہور عیسائی مورخ اڈورڈ ہارٹ لیکی کے حوالہ سے نقل کیا ہے،

"انکسار اور فروتنی کا وصف تمام تر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے، اور گو یہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزون و مناسب رہا، تاہم تمدن کی روز افزون ترقی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دیسکا، ترقی تمدن کے لئے لازمی ہے کہ قوم مین خودداری ہو، اور حریت کے جذبات موجود ہون، اور انکسار و تواضع اس کے دشمن ہین، خانقاہانہ طرز زندگی کا مثل فوجی طرز زندگی کے اقتضاء یہ ہے، کہ استبدادی حکومت ہو، تاہم سپاہیون مین تو پھر فی الجملہ خودی و خودداری موجود ہوتی ہے، لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہانہ طرز زندگی کا مطمح نظر تھا، کسی طرح ترقی تمدن کے حق مین مفید نہین پڑسکتا تھا، اور پھر بڑے بڑے زاہدون مین تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا بھی ہوتے رہتے ہین، لیکن عوام مین تجربہ سے معلوم ہوا، کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مرادف ہو جاتا ہے"،

عوام مین عدم تشدد کا جذبہ پیدا کرکے ہزارہا سال کی کھوئی حکومت کے جو خواب دیکھ رہے ہین، وہ سُن رہے ہین، لیکی کیا کہہ رہا ہے، نظریہ کے طور پر نہین، تجربہ کی بنیاد پر کہہ رہا ہے،

مختلف اخلاقی امراض کے مختلف نسخے

سید صاحب نے سچ لکھا ہے کہ ہر مرض کی دوا صرف بیچارے حکیم شافی[1]

[1] ایک لطیفہ کی طرف اشارہ ہے، کہ کسی حکیم کے صاحبزادے طب نہ پڑھ سکے، والد کی وفات کے بعد گدی

ہی تجویز کر سکتے تھے یہ لطیفہ تو خاکسار کا ہے، سید صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہین،

"اخلاقی تعلیم کوئی ایسی طب نہین ہے جس کا ایک ہی نسخہ ہر بیمار کی اندرونی بیماریون کا علاج ہو، تمام انسانون کی اندرونی کیفیتین اخلاقی استعدادین اور نفسانی قوتین یکسان نہین، انسانون مین کمزور و پست بھی ہین اور قوی و بلند حوصلہ بھی، خاکسار و متواضع بھی، مغرور و خوددار بھی، بزدل بھی ہین، بہادر بھی ہین اور بردبار بھی ہین، غضبناک بھی بخیل بھی ہین اور فضول خرچ بھی، گداگر بھی ہین اور فیاض بھی، ناامید بھی ہین اور پرامید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہین، قوی دل بھی، ظالم و زبردست بھی ہین ذلیل و خوار بھی،

آخر مین لکھتے ہین :-

"الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات و مراتب ہین کہ سب کیلئے ایک ہی دوا کبھی کارآمد نہین ہو سکتی"

اور نتیجہ کو اس جملہ پر ختم فرماتے ہین :-

"بہترین اخلاقی معالج وہ ہے جس نے ہر شخص ہر قوم ہر زمانہ کے مطابق اپنے نسخے ترتیب دیئے ہون، اور ہر قسم کے مریضون کو صحیح تندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو"

سید صاحب فرماتے ہین، کہ اور یہی وہ نسخہ تھا جس نے دس سال کی مدت مین آج سے تیرہ سو برس پہلے جو اثرات اپنے دکھائے تھے، وہ بجائے خود ہین ہی لیکن لکھتا ہے، کہ آج بھی جو کچھ ہے وہ بھی اس کے نسخے کے بعض اجزاء کا ایک عصری تجربہ ہے، سید صاحب نے یہ لکھ کر کہ آج یورپ

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۵) پر بیٹھے، صرف "سنا" یاد تھا، ہر نسخہ مین یہی لکھتے تھے، جلاب کی وجہ سے عموماً فائدہ بھی ہو جاتا تھا، کہا جاتا ہے، کہ ایک دھوبی نے گدہا کھونے کا مرض حکیم صاحب کے آگے پیش کیا، حکیم نے مرض سمجھکر سنا لکھدیا، رات کو جلاب کی آواز سے گدہا جو کہین کھڑا تھا، پکڑ گیا، دھوبی نے دوسرے دن شکرانہ کی نعمیں پیش کین تو اللہ میان کی بھی کیا باتین ہین تو ادیات ہے

کو جو کچھ ملا ہے،

"ان مین ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی جب تک اصلاح و تجدید کے نام سے اسلامی اصول کو عاریۃً اس نے قبول نہ کیا"

یعنی مسلم آئین ہوا کا فرق تو ملے حور و قصور، سید صاحب کا اشارہ بتمام بالاسلام لوتھر کی تجدیدی تحریک کی طرف ہے، جس کا کچھ ذکر آگے رہا ہے،

بہر حال اسلامی تعلیمات کی اس امتزاجی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سید صاحب فرماتے ہین :-

"وہ (شریعت محمدی) عدل و انصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے، اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگون کی روحانی تکمیل مین بھی کسی طرح حارج نہین"

ختم کرتے ہوئے

"وہ نہ یہودیون کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے، اور نہ عیسائیون کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے"

فرما کر مکمل اسلام کی بہترین واقعی تعبیر یہ ہے،

"بلکہ وہ جسم و جان کا مجموعہ اور زندہ و محسوس پیکر ہے"

اسلامی اخلاق مین عدل و احسان کا اجتماع

عدل و احسان کے امتزاج سے جو بات اسلامی شریعت مین پیدا ہو گئی ہے، اسی طرز عمل کو عفو و انتقام مین ملحوظ رکھ کر بقول سید صاحب :-

"اگر انتقام و سزا کا اصول نہ ہو، تو جماعت کا نظام قائم نہین رہ سکتا، اور نہ ملک مین امن و امان رہ سکتا ہے، اور نہ ملک کے افراد کے بڑے حصہ کو برائیون سے

باز رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، اور اگر عفو نہ ہو، تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے۔"

الغرض توراۃ کا قانون "آنکھ کے بدلے آنکھ" اور انجیل کا وعظ "گال کے بعد دوسرا گال" دونون کو سامنے رکھ کر سید صاحب نے دکھایا ہے کہ اخلاق کے ان دونون اصولون کو اسلام مین جمع کر کے اجتماعی نظام کو برقرار رکھتے ہوئے افراد کے لئے آگے بڑھنے کی تمام راہین انتہائی فیاضی کیساتھ کھولدی گئی ہین، انتقام اجتماع کے لئے اور عفو افراد کے لئے اس سلسلہ مین قرآنی نصوص صحیح احادیث، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمۃ للعالمینی کے ساتھ

ولوان فاطمۃ بنت محمد سرقت	اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ
لقطعت یدھا	(اعاذ باللہ) بھی چوری کرین تو مین ان کا ہاتھ کاٹ دون گا،

جیسے مختلف اعلانات کی روشنی مین

ایک تیرہ سادگی مین ایک سیدہ بانکپن میں

کا عجب نقشہ پیش کیا ہے، کتاب کا یہ حصہ خاص طور پر قابل غور و تامل ہے، خصوصاً ان مسکین وطن دار اور بے مایہ مقررون کے لئے جن کے دماغ مین اسلام کی فضیلت کا معیار ایک گال کے مقابلہ مین دوسرے گال کے پیش کرنے کی اصلاح کے سوا اور کچھ نہین ہے، چالیس پچاس سال کے قریب تو میرا ذاتی تجربہ ہے، کہ مشکل ہی سے کسی تجدد پسند خطیب کے خطبہ مین میرے کانون نے اسے نہ سنا ہو، مجھے امید ہے کہ سید صاحب کی کتاب سے ان بیچارون کے لئے بھی اچھا مواد فراہم ہو گیا، کاش! معاصرت کی منافرت سے دل پاک ہون، اور مومن کو اپنے ضالہ (گم شدہ چیز) کی تلاش مین ندوہ دیوبند فرنگی محل و علی گڈھ کے الفاظ حائل نہ ہون، جو آج بجائے "تعارف" کے "تجاہل"

و تغافل کا ذریعہ بنا ہوا ہے،

دشمنون کے ساتھ نیکی کی تعلیم | بہرحال اس بحث کو دین عیسوی کے مشہور سرمایۂ ناز، گوش آویز تعلیم کے ذکر پر سید صاحب نے ختم فرمایا ہے، یعنی عیسائی کہتے ہین، کہ ہم تھپڑ کا جواب تھپڑ سے دین، ہمین صرف اسی سے نہین روکا گیا ہے، بلکہ دوسرے گال کے پیش کرنے کیساتھ یہ بھی حکم دیا گیا ہے۔ کہ

"تم نے یہ کہتے سنا ہوگا، کہ اپنے عزیزون سے محبت اور اپنے دشمنون سے بغض رکھو، لیکن مین تم سے کہتا ہون کہ اپنے دشمن سے محبت رکھو" (متی باب ۵)

سید صاحب نے خود ایک عیسائی عالم[1] کے حوالہ سے دشمن کے پیار کرنے کے نظریہ کو غیر فطری ہونا ثابت کیا ہے، اور سچی بات بھی یہی ہے، کہ پیار اور محبت ظاہر ہے، کہ کی نہین جاتی، بلکہ ہو جاتی ہے، اور جو محبت کرنے کا ارادہ کرے گا، وہ کوئی اور چیز تو ہو سکتی ہے، لیکن محبت نہین ہو سکتی، ہان اس زمانہ مین اگر یہ ہو رہا ہے کہ

بھرتے ہین میری آہ کو فونو گراف مین
کہتے ہین فیس لیجئے اور آہ کیجئے! (اکبرؒ)

تو فیس والی آہ اگر آہ ہو سکتی ہے، تو جو ہو جاتی نہین، بلکہ کیجاتی ہے، وہ محبت بھی ہو سکتی ہے، لیکن :-

اخلاق محمدی نے اس کے بجائے وہ تعلیم دی ہے، جس پر ہر خوش نصیب سے عمل ممکن ہے، اور اللہ کے بندون نے ہمیشہ اس پر عمل کیا، یعنی دشمنون کے ساتھ نیک سلوک کرو، برا چاہنے والون کے ساتھ بھلائی کرو، جو تم کو بد دعائیں دین ان کو دعا دو، جو تمھارا قصور کرین ان کو معاف کرو، جو تم پر ظلم کرین ان سے انصاف کرو۔"

---

[1] اسکاٹ کی تفسیر متی، ۱۲۱۔

سید صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جہان حکومت اور جماعت کے لئے، انتقام وار دگیر کا قانون ہے، وہین روحانی بلندیون کی آخری زینون تک چڑھنے کے لئے افراد کے سامنے اسلام نے ایسی تمام راہین کھول دی ہین جنھین آدمی صرف سُن ہی نہین سکتا، بلکہ ان پر چل بھی سکتا ہے، اس سلسلہ مین خود پیش کرنے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عملی نمونون کے ساتھ ساتھ قرآنی آیتین، نبوی ارشادات کا ایک طویل سلسلہ ہے، جسے سید صاحب ...... یکے بعد دیگرے اس طرح پیش کرتے چلے گئے ہین، کہ اس کے بعد قومون کی ان تنگ نظریون پر حیرت ہوتی ہے جنھون نے اپنی ہلدی کی ایک گرہ سے دنیا کے اخلاقی بازارون کو سر پر اٹھا لیا، لیکن انسانیت کے آخری طبیب اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے عطاخانہ کے بے شمار نوشدارون، اور جواہر مہرون کے ذکر کو اس طرح دبانے کی کوشش کی گئی کہ گویا تلوار کے سوا اسلام کے پاس کچھ نہین ہے، اور "تلوار" کے اس زہر کا ایسا پروپاگنڈا کیا گیا، کہ غیر تو غیر اپنون کو بھی یاد نہین رہا کہ ہمارے گھر کی الماریون مین کیا، کھا ہوا ہے، خصوصاً قرآن کی آیت

ادْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ	"بہترین ذرائع سے مدافعت اور مقابلہ کرو
بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ	(اس کا نتیجہ یہ ہوگا) کہ اچانک وہی جس
وَلِيٌّ حَمِيْمٌ وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ	مین اور تم مین دشمنی تھی، گویا کہ ایک گرم
صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْحَظٍّ	جوش دوست بن جائے گا، اس اصول
عَظِيْمٍ (فصلت - ۵)	کو وہی اپنے اندر اتار سکتے ہین، جو صبر
	کرین اور اس کو اپنے اندر وہی اتار سکتا

(جو بڑا صاحب نصیب ہو)

بن جائے تشدد کے عدم تشدد کے ہتھیار سے دشمن پر فتح اور فتح عظیم یعنی صرف یہی نہین کہ اس کی عداوت جاتی رہے گی، بلکہ دوست اور گرم جوش دوست بن جائے گا، اسکی جو بشارت دی گئی ہے، بلکہ ذمہ داری لی گئی ہے، کہ ایسا ہو کر رہے گا، سوچا جا سکتا ہے، کہ آج اس کی شعاعون

کو جن خاص دماغون کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے، یہ کرنین کس آفتاب جہانتاب کے چشمہ سے اچک لی گئی ہین، صلوٰۃ اللہ علیہ وسلامہ دشمن سے محبت کرنا اور دشمن مین اپنی محبت پیدا کرا دونون مین کون اختیاری ہے یہ بھی قابلِ غور ہے،

الغرض انسانیت کے آخری دواخانہ مین جس کے بعد پھر قدرت دنیا کو کچھ دینے والی نہین تھی، اس مین وہ سب کچھ ہے، جو سوچا گیا، سوچا جا رہا ہے یا آیندہ سوچا جائے گا، لیکن

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست
سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

ہر عطائی خود رو مدعی کا یہ کام نہین، کہ اپنے خاص محل اور مقام پر ان دواؤن کا استعمال کرے

ہر ہوسناکے نداند جام وسندان باختن

اسلامی اصول اخلاق سے یورپ کا استفادہ

بحمد اللہ اس کتاب مین سید صاحب نے جس حد تک استعمالی مواقع کو متعین کرکے کلیاتی قوانین مرتب کئے ہین آج بھی انکی جان بخشیون سے وہی نفع اٹھایا جا سکتا ہے جتنا کل اٹھایا گیا تھا، انہون ہی نے نہین بلکہ سید صاحب ہی کی زبانی سُن چکے کہ اس کے بعد جہان کہین بھی جس کسی نے جس حد تک جو کچھ بھی پایا، یا آیندہ جو پاوین گے، مورخ کو یہ تسلیم کرنا پڑیگا مجبوراً تسلیم کرنا پڑے گا، کہ یہ اسی "چشمۂ حیات" کی لہرون کی نمائش ہے، یورپ مین آج جو کچھ ہے جس تحریک کا اُسے نتیجہ قرار دیا جاتا ہے، لیکی نے اپنی تاریخ اخلاق یورپ مین جو یہ لکھا تھا جیسا کہ سید صاحب نے نقل فرمایا ہے، کہ

"پروٹسٹنٹ ممالک مین جو صاف گوئی، آزاد خیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت و حمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے، وہ کیتھولک علاقون مین نہین پائی جاتی"

[1] ترجمہ مولینا عبدالماجد دریابادی سلمہ اللہ تعالیٰ،

اس کے بعد اگر تاریخ کا یہ مسئلہ صحیح ہے، کہ پروٹسٹنٹ تحریک کے سب سے بڑے علم بردار لوتھر کا دماغی و ذہنی تلاطم، بہت زیادہ اسلامی تحریکات کا رہین منت ہے، تو کوئی شبہہ نہیں کہ یورپ مین جو کچھ ہے جس شکل مین بھی ہی، عیسائیت کا تحفہ تو قطعاً نہین ہے، اور جب عیسائیت کا نہین ہے، تو پھر خود انصاف کرو، کہ کس کا ہوسکتا ہی، مسیح علیہ السلام کے بعد "اخلاقی دنیا" مین انقلاب پھر کہان سے اٹھا اور کہان تک پہونچا، اگر عیسائیت ہی ان نتائج کی ذمہ دار ہوتی، تو عیسائیون ہی کا جو طبقہ لوتھر اور لوتھر کی تحریک سے الگ رہا یا رکھا گیا، یہی لیکی اس کے متعلق یہ ہرگز نہ لکھتا،

"بلکہ بجائے ان کے (گذشتہ بالا اوصاف کے) ان مین (رومن کیتھولک والون مین) دنائت پست ہمتی، کم ظرفی، بزدلی، گداگری کے مناظر سامنے آتے ہین، اور سب سے بڑھکر یہ کہ اول الذکرین سیاسی حریت کی جو جلوہ نمائیان ہین، ان سے آخرالذکر یکسر خالی ہین"

یہ لیکی نے کیا لکھدیا، طاؤس محو رقص تھا، اس کی نظر کہان پہونچا دی گئی، تنی ہوئی گردن جھک گئی، قلم چھوٹ گیا، دل بیٹھا جاتا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہوش آیا تو پھر کبھی،

سیرۃ النبی جلد ششم

اس مین حقوق، فضائل اور آداب کے عنوانون اور انکی ذیلی سرخیون کے تحت اخلاقی تعلیمات کی تفصیل ہی، حجم ۱۲۰ صفحے تقطیع کلان قسم اول ۵ر قسم دوم للعہ؎

"منیجر"

مسئلہ اصلاح تعلیم
نفسیاتی اصول پر

از

مولینا عبد السلام ندوی

(۲)

مینجنگ کمیٹی (منیجر یا ناظم) تجارتی اور صنعتی کارخانون کی قدر و قیمت کا اندازہ ان کے منیجرون اور ڈائرکٹرون کی قدر و قیمت سے کیا جاتا ہی اور یہ ایک ایسی بدیہی بات ہی جس کے ثابت کرنے کے لئے دلیل و برہان کی ضرورت نہین، اور اس لحاظ سے سکنڈری اسکولون کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی ان کے منیجرون اور ناظمون کی قدر و قیمت سے کرنا چاہئے لیکن ایسا صرف مذہبی مدارس مین کیا جاسکتا ہے، سرکاری مدارس مین نہین کیا جاسکتا (اس سے عربی مدارس کا تفوق انگریزی مدارس پر ثابت ہوتا ہے) جسکی وجہ یہ ہی کہ ہر سکنڈری اسکول کا منیجر یا ناظم برائے نام منیجر یا ناظم ہوتا ہی، ورنہ درحقیقت اس کی حیثیت ایک محرر سے زیادہ نہین ہوتی، یعنی وہ ہمیشہ حساب و کتاب کی جانچ پڑتال مین مشغول رہتا ہی اور وزارت تعلیم کے احکام کا اجرا اوس کا اصلی فرض منصبی ہوتا ہی خود اسکا کوئی اثر و اقتدار نہیں ہوتا، اس کے افسر اوس پر الزام لگا سکتے ہین، اساتذہ اسکو نفرت کی نگاہ سے دیکھ سکتے ہین، اور طلبہ اوس سے بالکل خوف نہین کھاتے، اسلئے اس کا کام ایک ملازم کا کام ہوتا ہے، منیجر یا ناظم کا کام نہین ہوتا، وہ ایک ایسا ملازم ہوتا ہی جس پر بڑے بڑے اسکولون مین کام کا غیر معمولی بوجھ پڑتا ہی کیونکہ

وزیر تعلیم کا اقتدار جو مدرسہ کی ہر چیز کے متعلق باز پرس کر سکتا ہے، اس منیجر یا ناظم کو اس پر مجبور کرتا ہے کہ وہ وزیر تعلیم کو تمام معاملات کی اطلاع دیتا رہے، اس لئے وہ وقت کا اکثر حصہ اس مین صرف کرتا ہے اور ہمیشہ انسپکٹر اور وزیر تعلیم سے خط وکتابت کرتا رہتا ہے، اور ان کی رپورٹون اور یادداشتون کے پھیر مین رہتا ہے، اس لئے وہ خود اسکول کے انتظام مین اپنا بہت کم وقت صرف کر سکتا ہے، اور طلبہ کی عقلی اور اخلاقی تربیت کی طرف بہت کم متوجہ ہو سکتا ہے، وہ حساب وکتاب کے محررون کی طرح صرف بجٹ بناتا رہتا ہے، اور یہ ایک بالکل سرکاری کام ہے،

گورنمنٹ کے اثر سے آزادی ان تصریحات سے معلوم ہوا ہو گا، کہ تعلیم مین جو نقائص ہین، ان کی ذمہ داری تمامتر گورنمنٹ پر ہے، اسلئے اصلاح تعلیم صرف اس صورت مین ممکن ہے، جب تعلیم وزارت تعلیم کے عہدہ دارون کے اثر سے آزاد ہو، نصاب تعلیم مین جو نقائص ہین، طریقہ امتحان مین جو نقائص ہین، مختلف تعلیمی ڈگریون مین جو نقائص ہین، ان کی ذمہ داری صرف یونیورسٹیون پر عائد نہین ہوتی، بلکہ ان کی اصلی ذمہ دار گورنمنٹ اور گورنمنٹ سے زیادہ وزارت تعلیم کا محکمہ ہے،

اس لئے اگر تعلیم کی اصلاح منظور ہے، تو اوس کو سب سے پہلے گورنمنٹ کے اثر سے آزاد کرانا چاہئے ایک پروفیسر نہایت غضب آلود لہجے مین کہتا ہے،

سخت ضرورت کا اقتضا یہ ہے، کہ تعلیم گورنمنٹ کے اس جابرانہ اقتدار سے آزاد ہو اور یونیورسٹیان اس جبر سے نجات پائین، کیونکہ یہ اقتدار ہمیشہ اعلیٰ تعلیم پر دباؤ ڈالتا رہتا ہے، اور اس کو قدیم طریقہ تعلیم سے ہٹنے نہیں دیتا، کاش ایک دلیر وزیر جو اس اقتدار کو سلب کر سکتا ہو، ہم کو تعلیم کے درجے مقرر کرنے، اور ایم اے، اور بی اے کا خطاب دینے کا حق عطا کرے،

اوقات تعلیم کی اصلاح جن مزدورون کو بہت زیادہ سخت کام کرنے پڑتے ہین، فرانس مین ان کے

اوقات عمل سے بھی اوقات تعلیم زیادہ ہین، اصول حفظان صحت کا لحاظ بالکل نہین کیا جاتا، اور طلبہ کو کھانا نہایت برا ملتا ہے، اس بنا پر ایک طالب العلم خوشگوار اور کھلی ہوا مین ڈھائی گھنٹہ سے زیادہ نہین بسر کر سکتا، لیکن جس شخص کو نشو ونما کی ضرورت ہے، اوس کے لئے اس قدر کم وقت نہایت مضر ہے، اتوار او رجرات کی ورزش غیر مفید اور غیر لذیذ ہے، ایک طالب العلم نہایت بے لطفی کے ساتھ سڑکون پر مارا مارا پھرتا ہے، پھر شام کو تھکا ماندہ واپس آجاتا ہے، اسکی اصلاح کی صورت صرف یہ ہے کہ اوقات درس مین کمی کیجائے لیکن اس مین بڑی دشواریان پیش آتی ہین، طالب العلمون کو ۱۲ گھنٹے درس کے کمرے مین اسلئے رکھا جاتا ہے، کہ ان کی نگرانی سے نجات ملے، باپ، مان، مدرسہ کے نگران کار، اور اساتذہ سب کے سب ان کی نگرانی کی زحمت گوارا نہین کرتے، اسلئے ان کو ۱۲ گھنٹے درس کے کمرے مین بند رکھتے ہین، تاہم اوقات تعلیم مین اصلاحًا کمی کر دی گئی ہے، لیکن طلبہ ان سے کوئی فائدہ نہین اٹھاتے، کیونکہ فرصت کے اوقات کو وہ سیر وتفریح یا ورزش جسمانی مین صرف نہین کرتے، بلکہ مجبوراً ان کو یہ اوقات مذاکرہ کے کمرے مین صرف کرنے پڑتے ہین،

مصارف تعلیم کی اصلاح ہندوستان کا حال تو معلوم نہین، لیکن لیبان کی تحقیق کے مطابق فرانس مین ۱۸۹۵ء کے بجٹ کے مطابق، اسکولون کا بحون، اور یونیورسٹیون کے مصارف کی تقسیم فی طلبہ حسب ذیل تھی،

۳۰۰ فرنک فی طلبہ	سکنڈری اسکولون مین،
۵،۷ فرنک فی طلبہ	کالجون مین،
۴۹۵ فرنک فی طلبہ	یونیورسٹیون مین،

اس سے معلوم ہوا کہ حکومت اعلیٰ طبقہ کے لڑکون پر ابتدائی اور متوسط تعلیم سے زیادہ روپیہ صرف کرتی ہے، جو بہرحال ایک قابل اعتراض اور قابل اصلاح چیز ہے،

لیکن ان عظیم الشان مصارف کا سبب کیا ہے،؟

(۱) ایک تو عیش پسندی، کیونکہ جس قدر یونیورسٹیون کی تعلیم شاندار ہوتی ہے، اوسی نسبت سے طلبہ کے رہنے کے مکانات بھی شاندار ہوتے ہین، موسیو **ساباتیہ** کا بیان ہے، کہ "لاکانال" کے مدرسہ پر جس مین صرف ۱۵۰ طالب العلم رہتے ہین، گورنمنٹ کو دس ملین فرنک سے زیادہ صرف کرنا پڑا، اور ہر طالب العلم کی اقامت گاہ پر ۷۵ فرنک صرف ہوئے، حالانکہ گورنمنٹ اسی رقم مین ہر طالب العلم کیلئے ایک چھوٹا سا مکان ایسا بنا سکتی تھی، جس مین وہ مع اپنے خاندان کے قیام کر سکتا تھا،

(۲) چونکہ تمام مدارس کے قواعد یکسان ہین، اس لئے ان کے مصارف بھی یکسان ہین، یہان تک کہ اگر ایک مدرسہ مین ایک طالب العلم بھی موجود نہ ہو تو گورنمنٹ کو اساتذہ کی تنخواہ دینی پڑے گی، چنانچہ بہت سے اساتذہ ایسے نکلے، جن سے صرف پانچ طالب العلم سبق لیتے تھے، اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالین ہین، اور اس قسم کے اسراف کا تحمل کچھ آسان نہین ہے،

(۳) خود منیجر یا ناظم کو اپنا کوئی فائدہ کفایت شعاری مین نظر نہین آتا، بلکہ وہ اسراف ہی مین اپنا فائدہ دیکھتا ہے،

ان اسباب سے ان فضول خرچیون کی روک تھام کے لئے مدارس کے بجٹ کو اس قدر تنگ اور محدود کر دینا چاہئے، کہ کتنی ہی سخت ضرورت پیش آئے، اس مین ردّ و بدل کی گنجایش نہ ہو،

تعلیم کے نفسیاتی اصول

اوپر کی تصریحات سے ثابت ہوا ہوگا، کہ یونیورسٹیون مین تربیت و تعلیم کے جو اصول رائج ہین، ان کی کوئی قدر و قیمت نہین، بلکہ یون کہنا چاہئے کہ یونیورسٹیون مین تربیت و تعلیم کا کوئی اصول ہی نہین، لیکن باوجود اس کے اصلاح کی کوئی صورت بھی ممکن نہین ہے، اور ایسی حالت مین طریقۂ اصلاح کی بحث بھی ایک بے سود بحث ہے، اسلئے اس مضمون کو صرف تعلیم کے متداول طریقون کی تنقید تک محدود رہنا چاہئے، لیکن باین ہمہ تربیت و تعلیم کے وہ صحیح اصول بھی بیان کر دینے

چاہئین جن کو تعلیم کی ہر شاخ پر منطبق کیا جا سکے، اگرچہ سر دست ان کا کوئی عملی فائدہ نہین ہے تاہم جب جدید اقتصادی زندگی اساتذہ اور طلبہ کے والدین کی نفسانی حالت مین تغیر پیدا کریگی، تو یہ اصول مفید ثابت ہون گے، اور یہ سب قدیم طریقۂ تعلیم کے ترک کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگین گے

لیکن ان اصول کے سلسلے مین یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ یونیورسٹیان تعلیمی امور مین صرف قوتِ حافظہ پر اعتماد کرتی ہین، اور تعلیم کے صحیح اصول کی طرف ان کی توجہ نہین ہوتی، اس لئے جب اصلاحِ تعلیم کا مسئلہ پیش کیا جاتا ہے، تو وہ صرف نصابِ تعلیم مین تغیر پیدا کرتی ہین، طریقۂ تعلیم مین کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتین، یہی وجہ ہے کہ تمام اصلاحی تدبیرین بے کار ہو کر رہ جاتی ہین، اور اسی بنا پر تعلیم تنزل کے تحت الثریٰ تک پہونچ گئی ہے، اور اسی طریقہ کے مطابق طلبہ نے اپنی عمر کے آٹھ سال اُن مدرسون مین جو جیلخانون کے مشابہ ہین، ضائع کئے ہین، اور جب اس مدرسہ یا اس جیلخانہ سے نکلے ہین، تو چند سال کے بعد وہ سب کچھ بھول گئے ہین، جن کو بڑی محنت سے یاد کیا تھا، یہانتک کہ بعض غیر معمولی ذہانت کے لوگ جدید تربیت کے حاصل کرنے پر مجبور ہوئے ہین،

تعلیم و تربیت کے نفسیاتی نظریات

اس تمہید کے بعد اب ہم تعلیم و تربیت کے نفسیاتی نظریات یا تعلیم و تربیت کے صحیح اصول بیان کرتے ہین،

تصریحاتِ متذکرۂ بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ قوتِ حافظہ پر تعلیم و تربیت کی صحیح بنیاد نہین قائم کیجا سکتی، لیکن اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے، کہ پھر نفس کے کس مسئلہ پر تعلیم و تربیت کی بنیاد قائم کیجائے،

اس مین شبہہ نہین ہے کہ تعلیم و تربیت کے بنیادی اصول نصابِ تعلیم سے بالکل مختلف اور الگ ہین، لیکن باین ہمہ ان مین نصابِ تعلیم پر منطبق ہونے کی صلاحیت موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سی قومون کا نصابِ تعلیم اگرچہ متحد ہے، لیکن اس کے نتائج مختلف ہین، اور یہ اختلاف حیرت انگیز حد تک

پہونچا ہوا ہے، بہرحال تعلیم و تربیت کا نفسیاتی اصول اس قدر مختصر ہے، کہ اس کو صرف ایک لفظ میں بیان کیا جاسکتا ہے یعنی فن تربیت ایک ایسا فن ہو، جو شعوری چیزون کو لاشعوری چیزون کی شکل مین بدل دیتا ہو، اور جب شعوری چیز لاشعوری چیز کی شکل مین بدل جاتی ہے، تو وہ نفس مین ایک متصل و متواتر غیرارادی حرکت پیدا کر دیتی ہے، لیکن یہ انقلاب قانون اجتماع خیال سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے مربی یا معلم کا فرض ہے، کہ وہ بچے کے نفس مین ایسے خیالات پیدا کرتا رہے، جو باہم ایک دوسرے کو یاد دلاتے رہین، ابتدا مین تو بچے کو ان کا تھوڑا سا احساس ہوگا، لیکن آخر مین وہ اس کے نفس کا ایک جزو لاشعوری بن جائین گے، اور بچے کو جس فن کی تعلیم دینا مقصود ہو، خواہ زبان کی تعلیم ہو خواہ گھوڑے کی سواری کی تعلیم ہو، خواہ پیانو بجانے کی تعلیم ہو، ان سب مین صرف ایک ہی حرکت پائی جاتی ہے یعنی یہ کہ "قانون اجتماع خیال[1]" کے مطابق جو حرکت غیرارادیہ کا موجد ہے، شعوری چیز لاشعوری چیز کی شکل مین منتقل ہو جاتی ہے،

---

[1] قانون اجتماع خیال کی صرف دو صورتین، اوس کی اور تمام صورتون کا مرجع ہین، (۱) اجتماع خیال بحکم مجاورۃ (۲) اجتماع خیال بحکم تشابہ،

پہلی صورت کا منشا یہ ہے، کہ جب نفس پر ایک ہی وقت مین دو مختلف چیزون کا اثر پڑتا ہے، یا وہ پیہم آنے والے اوقات مین اون سے متاثر ہوتا ہے، تو ایک کی یاد سے دوسرے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور دوسری صورت کا منشا یہ ہے، کہ جو خیالات تمھارے دل میں اس وقت پیدا ہوتے ہین، وہ تمھارے گذشتہ خیالات کی یاد کو تازہ کر دین گے، بشرطیکہ ماضی اور حال کے خیالات مین مشابہت ہو، پہلی صورت پر تمام زندہ مخلوقات کی تعلیم و تربیت موقوف ہے، مثلاً گھوڑے کی تعلیم اسی صورت کے مطابق دیجاتی ہے، اور اس سے ایسے نتائج پیدا ہوتے ہین جو بظاہر متناقض معلوم ہوتے ہین، مثلاً اگر دوڑنے مین گھوڑے کو کوڑا مار دیا جائے، تو وہ دفعۃً

صرف تعلیم و تربیت ہی پر موقوف نہین، بلکہ ایک خاص انداز پر اخلاق کی نشو و نما بھی اسی قانون پر مبنی ہے، کیونکہ اخلاق کا اثر زندگی پر اوسی وقت پڑ سکتا ہے، جب وہ شعوری حالت سے غیرشعوری حالت مین منتقل ہو جائے، زندگی کی کل صرف اخلاق سے چلتی ہے، عقل اور کتاب کو زندگی کی کل کے چلانے مین کوئی دخل نہین ہے، اور جدید علم النفس نے ثابت کر دیا ہے، کہ ہماری روزانہ زندگی پر لاشعوری کیفیت کا اثر شعوری کیفیت سے زیادہ پڑتا ہے، لیکن حرکات غیرارادیہ کی ایجاد سے اس لاشعوری کیفیت کو نشو و نما حاصل ہوتی ہے، اور یہی حرکات غیرارادیہ تکرار و اعادہ کے بعد عادت بن جاتی ہین، اور جب ان عادتون کا اعادہ مختلف نسلون مین ہوتا رہتا ہے، تو وہ قوم کا اخلاق بن جاتی ہین، (حکمائے یونان اور حکمائے اسلام اسی حالت کو ملکہ راسخہ کہتے ہین، اور اچھے یا بُرے کام کے ملکہ راسخہ کا نام ان کی اصطلاح مین اخلاق ہے) اس بنا پر ایک تربیت دینے والے کا کام صرف یہ ہے، کہ وہ ان حرکات غیرارادیہ پر اپنا اثر ڈالے یعنی اگر وہ مفید ہون تو ان کو اور طاقتور بنائے، اور اگر غیرمفید ہون تو ان کو کمزور کرے، یا سرے سے ان کے وجود ہی کا خاتمہ کر دے، اس لحاظ سے ہم بذات خود اپنی زندگی مین ایک "موثر لاشعوری" کی حیثیت رکھتے ہین، لیکن جب ہم نے اس کو پیدا کر لیا، تو پھر اس پر خود کوئی اثر نہین ڈال سکتے، اور اب وہ خود ہماری زندگی پر ایک جابرانہ اقتدار قائم کر لیتا ہے، لیکن یہ حرکات غیرارادیہ "قانون

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۸) رُک جاتا ہے، کیونکہ "اجتماع خیال بحکم مجاورۃ" کے مطابق بہت دن تک اوس کے سوار نے دوڑنے کی حالت میں کوڑا مارا ہے، اور ساتھ ساتھ لگام بھی کھینچ لی ہے، اس سے گھوڑے نے یہ تعلیم حاصل کی ہے، کہ کوڑے مارنے کا نتیجہ رُک جانا ہے، اس لئے جب اوس کو کوڑا مالجائے، اوس کو فوراً رُک جانا چاہئے، جس کے لئے لگام کھینچنے کی ضرورت نہین،

اجتماع خیال کے مطابق پیدا ہوتی ہین، اور بچہ جب چلنا سیکھتا ہے، اور جوان جب پیانو بجانے یا اور
کسی دستکاری کے فن کی تعلیم حاصل کرتا ہے، تو دونون صورتون مین اس قانون کا اثر یکسان ہوتا
ہے، لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، کہ جن حرکات غیرارادیہ کو تربیت کے ذریعہ سے پیدا کیا
جاتا ہے، وہ اتنی طاقتور نہین ہوتین، جتنی وہ حرکاتِ غیرارادیہ ہوتی ہین، جن کو استمرار زمانہ پیدا کر چکا ہے،
یعنی موجودہ حرکات غیرارادیہ گذشتہ حرکاتِ غیرارادیہ کے مقابلے مین ضعیف ہوتی ہین، اس بنا پر
قومون اور جماعتون کے موروثی اور خاندانی اخلاق و عادات کو تربیت بہت کم بدل سکتی ہے، اس لئے
جن حرکاتِ غیرارادیہ کو تربیت نے پیدا کیا ہے، اگر بار بار ان کا تکرار و اعادہ نہ کیا جائے، تو وہ پہلے
کمزور اور کمزور ہونے کے بعد بالکل فنا ہو جاتی ہین، کیونکہ وہ عادت کا نتیجہ ہوتی ہین، اسلئے جب
عادت چلی جاتی ہے، تو عادت کے ساتھ ان کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شہسوار اور گوّیے
ہمیشہ اپنے فن کی مشق و تکرار کرتے رہتے ہین، تاکہ اس کو بالکل بھول نہ جائین، یہ ایک کھلی
ہوئی حقیقت ہے، کہ بعض حرکاتِ غیرارادیہ بعض دوسری حرکاتِ غیرارادیہ کو روکتی ہین، اور قوتِ
ارادی بھی ان حرکات کو روک سکتی ہے، مثلاً اگر ایک انسان اپنے ہاتھ کو دوسرے انسان
کی آنکھ کے قریب لیجائے تو وہ حرکتِ غیرارادی کے اثر سے اپنی آنکھ کو بند کر لیگا، لیکن تھوڑی
سی ارادی مشق کے بعد وہ اپنی آنکھ کو کھلا رکھ سکتا ہے،

تربیت کا سب سے بڑا مقصد موروثی اور غیرارادی حرکات کی تنظیم ہے، اور تمام لوگ انہی
غیرارادی حرکات کے زیرِ اثر ہین اسلئے ان حرکات کی اندرونی اور نفسیاتی تنظیم کرنی ضروری
ہے، اگرچہ چند افراد انکو منظم کر سکتے ہین، لیکن نوعِ انسانی کے اکثر و بیشتر افراد اس منزل سے بہت
دور ہین، لیکن جن لوگون نے ان کی تنظیم کر لی ہے، وہ بھی ان قوانین سے بے نیازی ظاہر کرتے ہین
جن کے ذریعہ سے ان حرکات کی تنظیم خارجی ہو سکتی ہے، وہ اپنے نفس پر اپنے ہی نفس کے ذریعہ

سے قابو پا لیتے ہین، لیکن ان کے علاوہ جو لوگ ہین، ان پر صرف قانون قابو پا سکتا ہے، اور یہ ایک
کھلی ہوئی حقیقت ہے، کہ جو جماعتین پولیس کے خوف پر اپنی اخلاقی بنیادین قائم کرتی ہین، اون کی
کوئی قدر و قیمت نہین ہوتی،

جو لوگ اپنے نفس پر اس اندرونی نظام کے ذریعہ سے قابو حاصل کر لیتے ہین، اونہی کی تعداد
پر پوری قوم کی قوت کا دارومدار ہوتا ہے، انگریزون مین اور فضائل کے ساتھ ضبطِ نفس کی کافی فضیلت بھی
موجود ہے، ایک پرانا حکیم اگر اس مقولے کے بجائے کہ

"اپنے نفس کو اپنے ہی نفس کے ذریعہ سے پہچانو"

اپنے گھر کی دیوار پر یہ مقولہ

"اپنے نفس پر اپنے ہی نفس کے ذریعہ سے قابو حاصل کرو"

لکھتا تو زیادہ مناسب ہوتا، کیونکہ نفس کی معرفت نہایت مشکل ہے، اور اُس سے صرف خاکساری
پیدا ہوتی ہے، لیکن ضبطِ نفس اوس سے آسان بھی ہے، اور زندگی کو طاقتور بھی بناتا ہے، اس لحاظ
سے ایک تربیت دہندہ کا فرض صرف یہ ہے کہ وہ بچے کی اسی قوتِ لاشعوریہ پر اثر ڈالے، اور اسکی
عقل کی طرف بالکل التفات نہ کرے، کیونکہ یہ ایک بالکل غیرمفید چیز ہے، بلکہ بہت زیادہ ترقی یافتہ
اخلاقی مذاہب سے معمولی درجہ کا نظام بھی جس کا بچہ کو خوگر کرایا جائے، زیادہ مفید ہے، بشرطیکہ وہ
نظام مضبوط اور طاقتور ہو، غیریقینی اور کمزور نہ ہو، غرض ایک تربیت دہندہ کا فرض یہ ہے، کہ
موروثی غیرارادی حرکات کے مقابلہ مین بچہ کے نفس مین جدید غیرارادی حرکات پیدا کرے، اس
طور پر کہ اگر وہ موروثی حرکتین مفید ہون، تو یہ جدید حرکتین ان کو طاقتور بنائین، اور اگر غیرمفید ہون
تو ان مین تغیر پیدا کرین، اگر کوئی موروثی مزاحمت نہ ہو تو نظامِ خارجی نظامِ داخلی کو پیدا کرتا ہے
اور اسی خارجی نظام کے مطابق ایک صناع اپنی صنعت کی اور ایک سپاہی اور ایک جہازران

اپنے اپنے فن کی تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہین، اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے، کہ جو طریقے ان غیرارادی حرکتون کی ایجاد کے لئے اختیار کئے جاتے ہین وہ اگرچہ موضوع کے اختلاف سے مختلف ہوتے ہیں لیکن سب کی اصل صرف ایک ہے یعنی یہ کہ بچہ جس چیز پر عمل کرنا چاہتا ہے، بار بار اس کا تکرار و اعادہ کرتا رہے، مختلف فنون مثلاً موسیقی اور تصویر کشی کے متعلق یونیورسٹیون کے اربابِ حل و عقد بھی ان واضح اصول مین شک و شبہہ نہین کرتے، لیکن اب تک ان کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ قواعد ہر اوس چیز مین برتے جا سکتے ہین، جن کو انسان حاصل کرنا چاہتا ہے خواہ وہ علم ہو، خواہ وہ فن ہو، خواہ وہ صنعت ہو، پس اگر ہم ان قواعد کے متعلق رائے عامہ کی تسلی کر سکین تو ۲۰ سال مین ہمارے پروفیسرون کو بھی یہ یقین آجائے گا، کہ جس نظامِ تعلیم کی بنیاد صرف قوت حافظہ پر قائم ہے، وہ بدترین تعلیمی نظام ہے، اور اس وقت موجودہ نظامِ تعلیم کی دیوار بالکل منہدم ہو جائے گی، جیسا کہ دوسرے قدیم نظامات کی دیوار منہدم ہو چکی ہے، اور اب ان کا کوئی حامی باقی نہین ہے؛

قومون کی فطرت اور اخلاق کے پیدا کرنے مین قانون اجتماعِ خیال کا اثر

جن اصول کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، وہ بالکل عام ہین یعنی وہ جس طرح جانورون کو شامل ہین، اوسی طرح انسان کو بھی شامل ہین، اور جس طرح قومون مین پائے جاتے ہین، اوسی طرح قومون کے افراد مین بھی پائے جاتے ہین، غرض ہر وہ چیز جو عقل سے حاصل کی جاتی ہے، اوس کا اصل الاصول یہ ہے، کہ شعوری چیز کو لاشعوری چیز کے قالب مین منتقل کرنے کے لئے "قانون اجتماع خیال" سے کام لینا چاہئے، اور اس کے سوا اس مقصد کے حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہین ہے،

اس اصول کی ہمہ گیری کے ثابت کرنے کیلئے ہم اوسکو چند مشقت طلب چیزون پر منطبق کرتے ہین، مثلاً قومون کے فطری جذبات اور اخلاق و عادات اوس بالواسطہ اثر سے پیدا ہوتے ہین جس کو قانون اجتماع خیال پیدا کرتا ہے، ایک بائسکل کا شہسوار یا فنِ موسیقی کا ماہر یا رسی پر چلنے والا

جو توازنِ جسم کو قائم رکھتا ہے، یا بچہ جب وہ اخلاق سیکھتا ہے، غرض یہ سب چیزین ان خیالات سے مرکب ہوتی ہین، جو مختلف خیالات پیدا کرتے ہین، اور وہ ان سب مین سے صرف مفید خیالات کو یا ان خیالات کو جو براہ راست ان مقاصد تک پہنچا دیتے ہین، جس کے لئے وہ یا اس کا معلم کد و کد کرتا ہے، اور انہی مختلف خیالات سے اس کے دل مین ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے، جس سے وہ اپنے فن مین نظم و ترتیب پیدا کر سکتا ہے لیکن وہ ملکہ فطرت نہین بن جاتا، کیونکہ ابتک وہ موروثی نہین ہو سکا ہے، لیکن جب وہ موروثی ہو کر تہذیب و تربیت سے بے نیاز ہو جاتا ہے، تو عین فطرت بن جاتا ہے؛

اس کے لئے ان پالتو جانورون کا دیکھ لینا کافی ہوگا، جو ہمارے گرد موجود ہین، کہ قانون اجتماع خیال کیونکر ان کے نفوس مین غیرارادی حرکات پیدا کرتا ہے، اور یہ حرکتین کیونکر نشو و نما حاصل کر کے لاشعوری ہو جاتی ہین، اس کے بعد ایک نسل سے دوسری نسل مین منتقل ہو کر موروثی ہوتی ہین، پھر فطرت بن جاتی ہین، اگرچہ علماء اس بحث کی طرف کافی توجہ نہین مبذول کی ہے، لیکن جب ان کو یہ معلوم ہو جائے گا، کہ بچون کی تربیت پر اس کا عظیم الشان اثر پڑتا ہے، تو وہ اس بحث کا پورا حق ادا کر دین گے، جن مثالون سے فطرت کی تخلیق و ایجاد کا حال معلوم ہو سکتا ہے، وہ اگرچہ بہت زیادہ اور بہت عام نہین ہین، لیکن وہ موجود ضرور ہین، اور آیندہ اون کی کثرت اور عام اشاعت ہوگی، مثلاً کتون مین چند فطری خصائل موجود ہین، اور یقیناً وہ تعلیم و تربیت سے پیدا ہوئے ہین، پھر اس کے بعد وہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہو ہو کر اس جانور کے لئے لازمی اور ضروری ہو گئے ہین، بہت سی عادتین ایسی بھی ہین، جو ابتک فطرت کے درجے پر نہین پہونچی ہین، لیکن اس درجے تک پہنچا چاہتی ہین، مثلاً شکار کے بعض جانور جو زور سے بھاگتے ہین، اور کتا دوڑا کر ان کو تھکا دیتا ہے، وہ کتے کو اس طرح فریب دیتے ہین، کہ اپنی جگہ شکار کے دوسرے جانور کو کھڑا کر دیتے ہین، جو زور سے دوڑتا ہے، اور کتا اس کا پیچھا کرتا ہے، اس طرح پہلا جانور آرام لے لیتا ہے، یہ ایک فریب

ہے، اور اس فریب سے بچنے کے لئے کتے ایک نئی عادت اختیار کرنا چاہتے ہین، جو اب تک فطرت کے درجہ کو نہین پہونچی ہے، لیکن رفتہ رفتہ پہونچ جائیگی، پروفیسر کوتو کہتا ہے کہ کتون کو صرف ساٹھ برس سے اس قسم کے فریب سے سابقہ پڑا ہے، اور اب تک وہ اس مین ماہر نہین ہوئے ہین، اور یہ مہارت ہو بھی نہین سکتی ہے، اس لئے کتے کی ہر نسل مین اس تربیت کو ترقی دینا چاہیے،

ان تمام نظریات سے یہ بات ہماری سمجھ مین آجاتی ہے، کہ قومون کے برے بھلے تمام اخلاق وعادات صرف تربیت کے اثر سے پیدا ہوتے ہین، کیونکہ یہ اخلاق وعادات اوس آب وہوا، اون جغرافیانہ حدود اور ان مواقع ومحل کا نتیجہ ہوتے ہین، جن کے ماحول مین یہ قومین کسی زمانہ مین رہ چکی ہین، لیکن کبھی کبھی یہ تمام موثرات بدل جاتے ہین، اور یہ اخلاق وعادات قائم رہتے ہین، کیونکہ ان کو اگرچہ ضرورت نے پیدا کیا تھا، لیکن بعد کو وہ فطرت بن گئے، اور ہر حالت مین ان قومون کیلئے لازمی اور ضروری ہوگئے، یہ ایک معقول بات ہے کہ جو قوم ایک بے آب وگیاہ اور مفلس وقلاّش جزیرہ مین آباد ہے، وہ بحری کامون مین جد وجہد کرکے اپنی معاش کے پیدا کرنے پر ضرورۃً مجبور ہوگی، لیکن یہ جد وجہد اوس کو اس قدر طاقتور بنادے گی، کہ وہ تمام فضائی مشکلات زندگی کا بآسانی مقابلہ کرسکے گی، اس بنا پر اس قوم نے اس قدر مشقت انگیز خصلتین صرف ضرورت سے مجبور ہوکر اپنے اندر پیدا کی ہین، لیکن رفتہ رفتہ انھون نے فطرت بن کر اوس قوم کو دوسری قومون سے ممتاز کر دیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک کھلی ہوئی بات ہے، کہ تربیت کو بھی مجبورانہ ضروریات وحالات کا قائم مقام بنایا جاسکتا ہے، اور ایک قوم تربیت کے اثر سے ایسی خصلتین سیکھ سکتی ہے جو پہلے تو موروثی اور نسلی، پھر اسکا اخلاق اور اسکی فطرت بن سکتی ہین، **لیبنیز** کی رائے ہے کہ کسی قوم کے بدلنے کیلئے ایک قرن کی ضرورت ہے جو بہت محدود ہوتا ہے، لیکن قومون کے اخلاق کی تخلیق وایجاد مین تربیت کو بھی ضروریات وحالات کا قائم مقام بنایا جاسکتا ہے"

موجودہ زمانہ مین تربیت کے اصول گذشتہ بیانات سے واضح ہوا ہو گا، کہ تربیت کے لئے چند اصول

کی ضرورت ہے، جن کو ان اصول سے ماخوذ ہونا چاہئے، جن کی تشریح ہم ابھی کرچکے ہین لیکن یہ اصول اس وقت تک نہین اخذ کئے جاسکتے، جب تک اوس علم النفس کا تفصیلی مطالعہ نہ کرلیا جائے، جو بچون اور جانورون کے ساتھ خاص تعلق رکھتا ہے، اور ہم نہایت نازک خیالی کے ساتھ یہ نہ جان لین، کہ ہم بچون اور جانورون مین عادت اور فطرت کو کیونکر پیدا کرسکتے ہین، لیکن یہ موضوع جس توجہ کا مستحق ہے، اوس کے لحاظ سے کما حقہ اس کا مطالعہ نہین کیا گیا، بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہین، کہ ایک سرے سے اوس کو ہاتھ ہی نہین لگایا گیا ہے، اس لئے ہم صرف شخصی تجربون پر قناعت کرتے ہین اور اور اس سے تربیت کی رہنمائی مین کام لیتے ہین، تاکہ جب بچون اور جانورون کی نفسیات کا کافی مطالعہ کرلیا جائے، اور تربیت کے متعلق کوئی کتاب لکھی جائے، تو اوس کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہو اور تربیت کو صحیح بنیاد پر ترقی دی جاسکے، **موسیو گوبیٹری** نے بالکل سچ لکھا ہے، کہ جب تک علم النفس کا صحیح طور پر مطالعہ نہ کرلیا جائے، تربیت صالحہ کی ایجاد ناممکن ہے، **موسیو لیون بورجوا** نے اپنی ایک کتاب مین جو ۱۸۹۵ء مین شائع ہوئی، اوستاد کو یہ نصیحت کی ہے، کہ وہ تربیت کے معاملہ مین بچے کی نفسیات پر اور تعلیم کے معاملہ مین نوجوانون کی نفسیات پر اعتماد کرے، کیونکہ بچے کی نفسیات کا مطالعہ اگر کیا گیا ہے تو کبھی کبھی کیا گیا ہے اور نوجوانون کی نفسیات کا تو سرے سے مطالعہ ہی نہین کیا گیا، یہ عجیب بات ہے کہ یہ علم (علم النفس) اگرچہ نہایت مفید اور نہایت اہم ہے تاہم کسی اوستاد کے دل مین اسکے مطالعہ کا شوق پیدا نہین ہوا، حالانکہ صرف اساتذہ ہی نوجوانون کی نفسیات کا مطالعہ کرسکتے ہین، بہرحال جرمنی کے ایک ہائی اسکول کے طریقہ تعلیم کے متعلق **موسیو ماسون فورستی** کا جو مضمون ایک اخبار مین ۲۵ ستمبر ۱۹۱۱ء مین شائع ہوا ہے، اوس کا خلاصہ حسب ذیل ہے،

اس اسکول کی تربیت کا قاعدہ یہ ہے، کہ جن گھنٹون مین طالب العلم خود کام کرتا ہے، ان کو جہان تک ممکن ہو کم کیا جائے، اس لئے وہ دو گھنٹون سے زائد نہین ہوتا، بقیہ دوسرے گھنٹون مین

طالب العلم کان اور آنکھ دونون سے تعلیم حاصل کرتا ہی اور درس کا گھنٹہ ۴۵ منٹ سے زیادہ نہین ہوتا اسلئے طلبہ بہت زیادہ آرام کرتے ہین، اور بہت زیادہ کھاتے ہین، طلبہ صرف اوسی مضمون کا سبق لیتے ہین، جو ان کی استعداد کے مناسب ہو، مثلاً اگر ایک درجہ کا طالب العلم کسی مضمون مین کمزور ہوگا، تو وہ اپنے درجہ سے نیچے کے درجہ مین اوس مضمون کی تعلیم حاصل کریگا، ایک اوستاد کے طالب العلمون کی تعداد ۱۲ یا ۱۳ سے زیادہ نہین ہوتی، اگر کوئی طالب العلم کلاس مین سبق کو نہ سمجھ سکے، تو کلاس ہو چکنے کے بعد وہ اس کو استاد سے سمجھ سکتا ہے، معمولی سزا خاموش رہنے کی سزا ہے یعنی طالب العلم کو تعطیل کے اوقات مین یہ سزا دی جاتی ہے، کہ وہ دن بھر چپ رہے، اور طلبہ کا بیان ہے کہ یہ سزا نہایت سخت ہے، لیکن باوجود اس سختی کے اوس کا عام رواج ہے، کیونکہ اوس مین بڑا فائدہ یہ ہے کہ جس طالب العلم کو زیادہ تر یہ سزا دی جاتی ہے، وہ بہت کم بولتا ہی اسلئے اس قسم کے سزا یافتہ طالب العلمون سے شور و شغب کرنے اور شیخی مارنے کا کوئی خوف نہیں ہوتا، طلبہ اپنے نفس پر قابو پا لیتے ہین، اس لئے جچے تلے الفاظ استعمال کرتے ہین، اور اچھی طرح سنتے ہین، اور اپنی زبان درازیون سے کسی کو دکھ نہین پہونچاتے، اس بنا پر لوگون کی دشمنی سے محفوظ رہتے ہین، ایک فرنچ طالب العلم سے جو اس مدرسہ مین پڑھتا تھا، یہ سوال کیا گیا، کہ وہ اس سخت نظام کو کیونکر برداشت کرسکتا ہے کیا اس کے دل مین اپنے خاندان مین واپس آنے کی خواہش نہین پیدا ہوتی، ؟ تو اوس نے یہ جواب دیا، کہ "اس مدرسہ مین مجھ کو بہت کم تکلیف محسوس ہوتی ہے، یہان تک کہ مین نے مدرسہ کو اپنے خاندان کی ملاقات پر اس لئے ترجیح دی ہے، کہ اس سفر مین شریک ہو سکون، جو طلبہ بیرونی مقامات کے دیکھنے کیلئے کرتے ہین، میرے ۲۰ کلاس فیلوزن نے بھی ایسا ہی کیا ہے، اور اوس وقت ہم ٹائرول سے واپس آرہے ہین"۔

اس وقت مختلف قسم کی تعلیم و تربیت کیلئے ہمارے یہان تفصیلی اور بہترین طریقے موجود نہین ہین

البتہ ایسے کلی اصول ضرور موجود ہین، جن سے ہم ان طریقون کا استنباط کرسکتے ہین، کیونکہ ہم کو اس قدر معلوم ہے کہ تربیت کا مقصد صرف یہ ہو کہ شعوری چیزون کو غیر شعوری چیزون کے قالب مین بدل دیا جائے، اس حالت مین ہمارا فرض صرف یہ ہو کہ تعلیم و تربیت کی ہر شاخ پر اس نظریہ کو منطبق کرین اور آیندہ فصلو مین جہانتک تربیت کا تعلق ہو ہم اس اصول کو تربیت پر منطبق کرنیکی کوشش کرینگے لیکن جن قومون کی تعلیم و تربیت کا معیار صرف امتحان ڈگریان اور قوت حافظہ ہے، وہ اس اصول کی اہمیت کا اندازہ نہین کرسکتین، کیونکہ اخلاق، قوت ارادی، اور شخصی اعمال امتحان کے دائرے مین نہین آتے، ہندوستان مین جب اخبارات نے اس پر شور و ہنگامہ برپا کیا کہ انگریزون نے بڑے بڑے عہدے صرف انگریزون کیلئے مخصوص کرلئے ہین، اور ہندوستانی ان سے محروم ہین، تو انگریزون کو امتحان اور مقابلہ و مسابقہ کی قدر و قیمت معلوم ہوئی، اور انھون نے ان عہدون کو امتحان و مقابلہ مین پورا کھینے کے لئے ایک بہترین میدان بنا لیا، اور ہندوستانیون کو بھی مقابلہ و مسابقہ کی اجازت دیدی، چونکہ ہندوستانیون کی قوت حافظہ انگریزون سے بہتر تھی، اس لئے اس میدان مین گوے سبقت لے گئے لیکن جب عمل کا وقت آیا تو ہندوستانیون کے عیوب اور انگریزون کے ہنر ظاہر ہونے لگے، جرمنون کو بھی یہ حقیقت معلوم ہوگئی، اور سب سے بڑے علمی عہدہ یعنی یونیورسٹیون کی پروفیسری کے لئے اونھون نے کوئی امتحان نہین قائم کیا، اسلئے جرمنی مین یونیورسٹیون کا کوئی پروفیسر یہ عہدہ امتحان سے نہین، بلکہ اپنے شخصی قابلیت عمل سے حاصل کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جرمنی کے پروفیسر تمام دنیا کی تعلیمی جماعتون سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتے ہین، اس کے بخلاف اور قومون مین امتحان ہی صرف ایک چیز ہے، اس لئے ایک شخص اپنی عمر کے چالیس سال صرف رٹنے مین صرف کر دیتا ہے، اس کے بعد امتحان دیتا ہے، اور امتحان کے بعد جو کچھ یاد کیا تھا، سب بھول جاتا ہے، اس لئے جب وہ پروفیسری کا عہدہ حاصل کرتا ہی تو بالکل بیکار ہو جاتا ہے، کیونکہ غیر مفید کامون مین اپنی عقلی قوت کو کھو کر اوس نے یہ عہدہ حاصل کیا ہے،

تربیت کا مقصد

اس زمانہ مین اخلاقی تربیت کا بڑا چرچا ہے، اور لوگ اوس کے متعلق بہت کچھ کہتے سنتے ہین، لیکن وہ اساتذہ کہان ہین جو اس تربیت کو عملی شکل مین لاکر اخلاق اور بڑے بڑے آدمیون کو پیدا کرین، ؟ بلکہ وہ اساتذہ بھی کہان ہین، جو اس تربیت کے طریقے بتائین، ؟ با این ہمہ یہ ایک اہم موضوع ہے، اس لئے اس پر دل کھول کر بحث کرنی چاہیے، اگر یہ سوال کیا جائے، کہ ایک شخص کی قدر وقیمت کا معیار کیا ہے، ؟ تو ایک لاطینی قوم کا آدمی اس کا یہ جواب دیگا، کہ "علم" لیکن خود علم کا معیار اوس کے نزدیک وہ ڈگریان ہین، جن کو ایک شخص حاصل کر چکا ہے، لیکن انگریزون اور امریکنون کو نہ علم کی پروا ہے، اور نہ وہ ڈگریون کو کوئی اہمیت دیتے، بلکہ اون کے نزدیک ایک شخص کی قدر وقیمت کا معیار اوس کا کیرکٹر، اسکی شخصیت اس کی قوتِ ارادی، اور اس کی قوتِ اختراع ہے، اگر ایک شخص ان فضائل کو حاصل کر چکا ہے، تو وہ ہر وقت اوس علم کو حاصل کر سکتا ہے جس کی اسکو ضرورت ہے، اور اگر بدقسمتی نے اس کو لوحِ جہان سے حرفِ مکرر کی طرح مٹا دیا ہے، تو اس حالت مین بھی اس کو یہ اعتماد حاصل ہے، کہ وہ ہر حالت مین ایک بڑا انسان بن سکتا ہے، مین پھر کہتا ہون کہ تربیت کا صحیح مقصد بعض اخلاق اور بعض اوصاف مثلاً شخصیت، قوتِ اختراع، قوتِ ارادی، اور باہمی تکفل کا احساس اور اس قسم کے اور بھی دوسرے اوصاف کو قوی اور پختہ بنانا ہے، لیکن یہ اوصاف اوس وقت تک پختہ نہین ہو سکتے، جب تک ان کی مشق نہ کیجائے، اور جب یہ صورت ہے، تو تربیت کا مقصد صرف فضائل کو پختہ بنانا اور رذائل کے ساتھ جنگ کرنا ہے، اس لحاظ سے ہر قوم کی تربیت الگ الگ طریقے کے مطابق ہونی چاہیے، کیونکہ ہر قوم کے فضائل جنکو پختہ بنانا اور ہر قوم کے رذائل جن کو کمزور کرنا مقصود ہے الگ الگ ہین، اس بنا پر ایک اطالوی، ایک فرانسیسی، ایک حبشی، اور ایک روسی کی تربیت کا طریقہ ایک نہین ہو سکتا، لیکن یونیورسٹیون کا جو نظام ہمارے یہان قائم ہے، وہ ہمارے اخلاقی عیوب کو دور نہین کرتا، بلکہ اون کو اور زیادہ نشو ونما دیتا ہے،

لاطینی قومون مین باہمی اعانت اور باہمی محبت کا جذبہ اوّلاً تو یون ہی کم ہے، اور رہا سہا جو کچھ ہے بھی، اس کو یونیورسٹیون کا یہ نفرت انگیز نظام یعنی باہمی مسابقت اور داد و ستد کا نظام اور بھی فنا کر رہا ہے، لاطینی قومون مین قوتِ اختراع اور قوتِ شخصیہ کا وجود بہت کم پایا جاتا ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ شدید نگرانی مین تعلیم و تربیت حاصل کرتی ہین، اون کے تمام اعمال منظم محدود اور معین ہوتے ہین، جس مین ان کا کوئی اختیار چلتا، نہ وہ اون مین تنوع وجدت پیدا کر سکتین، بلکہ ان کو اتنا وقت بھی نہین ملتا کہ وہ اس پر غور کر سکین، کہ ان کو تھوڑی سی آزادی حاصل ہے، جن بچون کے والدین، اور ان کے اساتذہ کو یہ خوف لگا رہتا ہے، کہ اگر وہ کسی عجائب خانہ کی سیر کو کسی محافظ کے بغیر گاڑی پر بیٹھکر چلے جائینگے، تو ان کو کوئی نہ کوئی خطرہ ضرور پیش آجائے گا، ان کی نسبت تم کس قسم کی رائے قائم کر سکو گے، ؟

لاطینی قومون مین قوتِ ارادی بہت کم پائی جاتی ہے، کیونکہ بچپن مین وہ خاندان کے زیرِ اقتدار اور جوانی مین مدرسہ کے زیرِ اثر نشو ونما اور تعلیم حاصل کرتے ہین، پھر جب سنِ رشد کو پہونچتے ہین، تو حکومت کی حمایت حاصل کرنے پر مرمٹتے ہین،

لاطینی قومون مین رواداری بھی بہت کم پائی جاتی ہے، کیونکہ وہ اپنے گرد و پیش کی تمام چیزون مین صرف تعصب ہی کی جلوہ گری دیکھتی ہین، مذہب مین بھی ان کو تعصب نظر آتا ہے، اور تعلیم بھی تعصب کا جلوہ دکھاتی ہے، اسلئے وہ مذہبی تعصب اور باغیانہ تعصب کی بھول بھلیان مین بھٹکتی پھرتی ہین، اور ان کے ارد گرد کوئی چیز ایسی نہین ہوتی، جو آزادی رائے کی محبوب ترین شکل ان کو دکھائے، یونیورسٹیون کے پروفیسر اور مذہبی مدرسون کے استاد باہم ایک دوسرے سے بغض رکھتے ہین، اور باہم ایک دوسرے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہین، اور اس طریقہ کی بنا پر یونیورسٹیون کے پروفیسر اور مذہبی مدارس کے استاد اپنے شاگردون کو اوس کھلی ہوائی فضا مین گھسنے نہین دیتے، جو صحیح علمی بحث کی فضا کے نام سے موسوم ہے، یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ تعصب لاطینی قومون کا سب سے بڑا اخلاقی

عیب ہی جوایک دن ان کوتنزل کی تحت الثریٰ تک پہونچا کے رہے گا، اسپین اپنی کل نوآبادیون کو کھوچکا، لیکن مذہبی اختلافات سے باز نہ آیا، اٹلی اور فرانس مین بھی ایسا ہی ہوتا ہوا نظر آتا ہی، اسی عیب کی بنا پر لاطینی قوم جو تمام متمدن قومون کا سرتاج تھی، اپنے درجہ سے گرنے لگی ہے، لیکن جب وہ تنزل کے آخری درجے کو پہونچ جائے گی، تو یونیورسٹیون کے پروفیسرون اور مذہبی مدارس کے اساتذہ پر اسکی بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوگی (ہندوستان کی تعلیمی اور اخلاقی حالت کو بھی اسی کسوٹی پر کسنا چاہیے، خواہ جدید تعلیم ہو خواہ قدیم)

تربیت کے نفسیاتی طریقے تعلیم اور تربیت دونون کی حالت یکسان ہے اور دونون مین یکسان طور پر شعوری چیزونکو غیرشعوری چیزونکے قالب مین ڈھالنا چاہی، بلکہ یہ صورت تربیت سے زیادہ تعلیم مین نمایان نظر آتی ہے، کیونکہ اخلاق وعادات مشق وتمرین سے پیدا کئے جاتے ہین، منطقیانہ اور فلسفیانہ بحث سے نہین پیدا کئے جاتے، اور قومون کے اخلاق کی حالت یہ ہی کہ وہ بالکل موروثی ہوتے ہین، اور ایک طویل زمانہ مین پیدا ہوتے ہین، اور تربیت کا اثر اون پر بہت کم پڑتا ہی، لیکن بااین ہمہ تربیت ان مین قوت اور نشو ونما کی صلاحیت پیدا کرسکتی ہے، اگرچہ اس علمی نظریہ کو تربیت وتعلیم پر منطبق کرنے کے لئے تربیت دہندہ کو فن تربیت کی نہایت مفصل کتابون کی ضرورت ہے، لیکن اس موقع پر صرف چند آسان مثالون کا بیان کردینا کافی ہوگا،

دیکھ بھال اور دقت نظری ان دونون کی ضرورت اگرچہ ہر وقت نہایت سخت ہی، "تاہم لوگ ان کے ساتھ بہت کم اعتنا کرتے ہین، "بلاکی کہتا ہے کہ "بعض لوگ آنکھین کھول کر چلتے تو ہین، مگر دیکھتے بالکل نہین، درحقیقت یہ نہایت عجیب بات ہی کہ ہم ٹکٹکی تو لگائے رہین، لیکن کچھ نہ دیکھ سکین، کیونکہ ہماری نگاہین کتابون کے دیکھنے کی خوگر ہین، دوسری چیزون کے دیکھنے کی خوگر نہین ہین، اسلئے اس طرف توجہ کرنے کی ان کو قدرت ہی حاصل نہین۔"

کیا تمھارا خیال ہے کہ ان دونون خصلتون کے پیدا کرنے کے لئے کسی عجیب وغریب طریقے کے ایجاد کرنے کی ضرورت ہوگی؟ نہین، صرف آسان طریقہ کا اختیار کرنا کافی ہوگا، البتہ وہ لوگون کو معلوم نہین، اس معاملہ مین صرف سیر وتفریح کے اوقات سے فائدہ اوٹھانا چاہیے، اور طالب العلم کو یہ بتانا چاہیے کہ وہ ہر چیز کو اچھی طرح دیکھے اور جس چیز کو دیکھے جہان تک ممکن ہو اوس کو نہایت باریک بینی کے ساتھ بیان کرے، طالب العلم کو یہ سکھانا ضروری نہین کہ وہ ہر چیز کو دیکھے، اور اس کے اوصاف بیان کرے، بلکہ اس کو ایک چھوٹی سی چیز، مثلاً جھروکہ، کسی گاڑی کی شکل، یا جھروکے یا گاڑی کے کسی حصہ کی طرف متوجہ کرنا چاہیے، پھر جب اس مشق کی ترقی پر ایک ہفتہ گذر جائے تو اس کے بعد اگر تم ایک طالب العلم سے یہ خواہش کروکہ اوس نے جو کچھ دیکھا ہے، اس کو بیان کرے تو تم کو اس کے بیان مین جو غیر متوقع باریک بینی نظر آئے گی، اوس سے تم حیرت زدہ ہوکر رہ جاؤگے، اس طرح آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے تم اوس طالب العلم کو اس درجہ تک پہنچا دوگے، کہ جس چیز کو وہ تفصیلاً دیکھتا تھا اس کو اجمالاً دیکھنے لگے گے، اس درجہ تک پہونچنے کے بعد تم اوس لغو ولاطائل سبق سے بے نیاز ہوجاؤ گے جس مین آندھی کے اوس طوفان کا بیان تھا جس کو طالب العلم نے نہین دیکھا تھا، اور بہادرون کی ایسی لڑائیون کا ذکر تھا، جو صرف کتابون مین لکھا ہوا تھا،

یہ ایک آسان طریقہ ہے لیکن یونیورسٹیون کے پروفیسر اوس سے بالکل ناواقف ہین، مین نے یورپ کے ایک شہر مین ٹریننگ کالج کے طالب العلمون کا ایک عجیب گروہ دیکھا، کہ وہ اپنے گردوپیش کی چیزون کی طرف قدم نہین بڑھاتا تھا، اور باریک بینی کے ساتھ اس شہر کا مطالعہ نہین کرتا تھا بلکہ کتابون کے اندر اس کا مطالعہ کرتا تھا، اور اوس شہر کے متعلق گذشتہ لوگون کی رائے سے بحث کرتا تھا، خود اوس شہر کو دیکھکر اپنی خاص رائے نہین قائم کرسکتا تھا،

ڈسپلن، باہمی اعانت، قوت فیصلہ اور اس قسم کی دوسری چیزونکے رجحان کی نشو ونما کا طریقہ یہ تمام خصلتین زندگی کے لئے نہایت ضروری اور لابدی

ہین اسی لئے انگریزون نے ان کی طرف شدت کیساتھ اپنی توجہ مبذول کی ہے، اور اون کھیلون کے ذریعہ سے جن کا نام "تربیت دینے والے کھیل" ہین، اونھون نے ان خصلتون کے میلان کو ترقی دینے لیکن مین اس کتاب مین ان کو بیان کرنا نہین چاہتا، کیونکہ یہ کھیل سخت محنت طلب اور پرازخطر ہین اس لئے فرنچ لوگ جو اپنے بچون کو خطرات سے ہمیشہ محفوظ رکھتے ہین، ان کو پسند نہ کرین گے، کیونکہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ فرنچ خاندان اپنے بچون کو خطرے مین کسی طرح مبتلا نہین ہونے دیتے اور علاوہ ازین نے مہتمم مدرسہ کو ان خطرات کا ذمہ دار قرار دیا ہے، جو ایک طالب العلم کو پیش آسکتے ہین، ایسی حالت مین باپ، مان اور اساتذہ مین سے کوئی بھی ان کھیلون کو پسند نہ کریگا اسلئے انکی تفصیل بالکل بے کار ہے لیکن باایں ہمہ تربیت پران کا عظیم الشان اثر پڑتا ہی، کیونکہ ان سے ایک طالب العلم کے دل مین قوت، ذمہ داری باہمی تکفل اور اس قسم کے دوسرے اوصاف واخلاق کا احساس پیدا ہوتا ہے، جو انگریزون کے حاکمانہ اقتدار کا سبب ہین، ہم مین اور انگریزون مین جو فرق ہے، اس کو مین ایک مثال کے ذریعہ سے بیان کرتا ہون، جن کو سن کر بہت سے لوگ حیرت زدہ ہوکر رہ گئے، جب انگریزون اور فرانسیسیون مین فٹ بال کا میچ ہوتا ہے، تو ہمیشہ انگریزون کی جیت ہوتی ہی، کیونکہ ایک انگریز جوان کھیل کے درمیان ہمیشہ اس بات کا خواہشمند ہوتا ہے، کہ اس کو نہین بلکہ اسکی پوری جماعت کو کامیابی حاصل ہو، اس لئے جب اس کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے، کہ تقدیر اسکی کامیابی مین رکاوٹ پیدا کرے گی، تو اپنے رفیق کی کامیابی کے لئے کوشش کرنے لگتا ہی، اور خود اپنی کامیابی کو نظر انداز کردیتا ہی، لیکن ایک فرنچ نوجوان کو صرف اپنی فکر پڑی رہتی ہے، کہ اگر کامیاب ہوتا ہے تو وہی کامیاب ہو ورنہ کسی کو بھی کامیابی نہ حاصل ہو، اسلئے جب تقدیر اس کا ساتھ نہین دیتی، تو اپنے رفیق کی اعانت کی فکر بھی نہین کرتا، کیونکہ اس کو بذات خود باہمی تکفل و اعانت کا احساس نہین ہے اس کو صرف اپنی فکر رہتی ہے، دوسرون سے اوس کو غرض نہین ہوتی، ہماری عام زندگی مین اس خلق

نے سخت خود غرضی پیدا کردی ہے، اور اس سے ہم پر ایسی مصیبتین نازل ہوئی ہین جن کو ہم آخری جنگ کے سلسلہ مین کبھی نہ بھولین گے،

یہ کھیل جس کے قدردان صرف انگریز ہین، ایک اور خلق کو پیدا کرتے ہین جس کا نام ضبط نفس ہے انگریز اس خلق کے بہت بڑے شیدائی ہین، یہان تک کہ جب کسی انگریز کو یہ محسوس ہوتا ہی کہ اس مین اس خلق کی کمی ہے تو اسکی نشو ونما، اور تقویت کے لئے وہ اپنے آپ کو بہت سے خطرون مین مبتلا کردیتا ہے، مین نے ہندوستان مین ایک انگریز سپاہی کو دیکھا، کہ وہ ہندوستان کے ایک حصہ مین جو ببر، اور موذی جانورون کا مرکز تھا، رات کو تنہا ان مصائب مین اپنے آپ کو مبتلا کرنے کے لئے نکلا اسی سپاہی کو مین نے ایک رات کو دیکھا، کہ جب تمام لوگ سوگئے، تو وہ ہوٹل سے نکلا، مین نے اوس سے پوچھا کہ اس خطرناک ملک مین تنہا کہان جاتے ہو، اس نے نہایت شرمندگی کیساتھ جواب دیا کہ اس کو ضبط نفس کی قدرت بہت کم ہے، اس لئے وہ اس خلق کے حاصل کرنے کے لئے تنہا نکلتا ہی اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ گھر سے نکل کر چیتے کے شکار کے لئے ایک ایسی کمین گاہ مین بیٹھا کرتا تھا، جس مین اس کو کوئی بیرونی مدد مل ہی نہین سکتی تھی، خطرے مین ڈالنے کی یہی ہمت انگریزون کا اخلاقی وصف ہے، اور اسی قسم کی اخلاقی فضیلتون کے ذریعہ سے وہ تمام دنیا پر حکومت کررہے ہین

(باقی)

نل دمن

از

ازجناب سالک رام صاحب شری واستویہ الہ آباد

نل دمن کے نام سے فیضی نے جس مثنوی کا ترجمہ کیا ہے، اس کا اصل نام سنسکرت میں "نے شدھ چرت" ہے، جس کو ملک الشعراء شری ہرش نے نظم کیا تھا،

بدقسمتی سے اگلے زمانہ میں بیشتر سنسکرت کی پرانی تصنیفات میں سوائے مصنف کے نام کے اور اس کے کوئی حالات نہ ہوتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کالی داس جیسے شاعر اعظم کے حالات اور زمانہ کے بارہ میں بھی علماء میں بہت دنوں تک اختلاف رہا، اور اب بھی ہے،

نل دمن یا "نے شدھ چرت" کے مصنف کے نام کے سوا اور کچھ معلوم نہ تھا، اس میں بھی یہ مشکل ہو کہ اس نام کے دو اور مشہور شاعر ہوئے ہیں، اس لئے اس کی تعیین میں کہ یہ کتاب کس شری ہرش کی تصنیف ہے، بہت مشکلات تھیں، مختلف تحقیقاتوں سے جو رائے قائم ہوئی ہے، اس کے مطابق "نے شدھ چرت" کے مصنف شری ہرش کا زمانہ بارھویں صدی کے شروع میں مانا جاتا ہے،

یہ سنسکرت کا بڑا بلند پایہ شاعر تھا، اسکی ذہانت لاثانی اور حافظہ لاجواب تھا، اس کی قوت حافظہ کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے، جس سے اس کے بعض دوسرے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے،

شری ہرش کا باپ ہیر (ہی ر) بنارس کے راجہ جے چندر کا درباری شاعر تھا، ہیر کے انتقال

کے بعد راجہ نے شری ہرش سے ایک اعلیٰ درجہ کی شاعرانہ تصنیف کی فرمائش کی، جس کی تعمیل میں اس نے بڑی کاوش سے یہ کتاب لکھی، راجہ نے اس کو بہت پسند کیا، مگر یہ حکم دیا کہ کشمیر جاکر وہاں کے بھی دربار کے پنڈتوں کو بھی دکھلاؤ، کیونکہ اس زمانہ میں بنارس کی طرح کشمیر بھی سنسکرت کا مرکز تھا،

اس حکم پر شری ہرش کشمیر گیا، مگر وہاں کے حاسد پنڈتوں نے دربار تک اس کی رسائی نہ ہونے دی، شری ہرش کچھ دنوں تک انتظار کرتا رہا، اتفاق سے ایک دن وہ ایک مندر میں پوجا کر رہا تھا، کہ قریب ہی ایک تالاب پر پانی بھرنے میں چند عورتوں میں تکرار ہوگئی، اور زبانی سخت کلامی کے بعد مار پیٹ کی نوبت پہونچی، اس واقعہ کی فریاد راجہ کے دربار میں ہوئی وہان سے شہادت طلب ہوئی، جائے وقوعہ کا شری ہرش کے سوا اور کوئی چشم دید گواہ نہ تھا، اس وسیلہ سے دربار تک اس کی رسائی ہوئی، وہان پہونچکر اوس نے سنسکرت میں کہا کہ میں اس ملک کی زبان نہیں سمجھتا، لیکن جو کچھ ان عورتوں میں گفتگو ہوئی ہے، اسکو میں بجنسہ دہرائے دیتا ہوں، چنانچہ اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ پوری گفتگو نقل کردی، سارا دربار اس لاجواب حافظہ پر دنگ رہ گیا، راجہ نے متحیر ہو کر اوس کا پتہ اور نشان دریافت کیا، اور اسکی تصنیف کو دیکھکر بڑی قدر کی، وہان کے پنڈتوں نے بھی اس کتاب کی خوبی کی سند دے دی،

یہ مسلّم ہو کہ اس کی یہ تصنیف مہا کاویہ یعنی نظم اعظم مانی جاتی ہو، اوس نے اس کتاب میں مضمون آفرینی اور نازک خیالی کا کمال دکھلایا ہے، اس کا تخیل بے نظیر اور جدت لاجواب ہے لیکن اسی کے ساتھ سنسکرت کے علماء کو یہ اعتراض بھی ہے کہ شری ہرش نے بعض مقامات کو شوکت لفظی اور صنائع و بدائع سے نہایت پیچیدہ اور ادق بنادیا ہو جس کا سمجھنا عام طور سے نہایت دشوار ہوگیا ہو

فیضی نے بھی اس دقت کو محسوس کیا ہو، چنانچہ کہتا ہے،

کین ذرہ نہ کار بازدم بود دین سنگ نہ ہم ترازدم بود

رفت از کفم اختیار بیرون کز حوصلہ بود کار بیرون

اس کتاب کے علاوہ شری ہرش کی آٹھ اور تصنیفات ہین، جو سب اپنے اپنے رنگ مین بے مثل مانی جاتی ہین،

اصل کتاب کے قصہ اور فیضی کی نل دمن مین جابجا اختلاف ہے، اس اختلاف کو مختصراً پیش کیا جاتا ہے، قصہ کا آغاز اس طرح ہے کہ

ودربھ (موجودہ برار) کے راجہ بھیم کی ایک نہایت حسین وجمیل لڑکی تھی، جس کا نام دمینتی (دم یَن تی) تھا، جب وہ سن بلوغ کو پہونچی تو راجہ نے اس کی شادی کے لئے برہمنون کو مختلف راجاؤن کے یہان بھیجا، نشدھ دیش کا راجہ نل اوس کے حسن وجمال کی تعریف سُن کر غائبانہ عاشق ہو گیا، اور غلبہ عشق سے رفتہ رفتہ اس کی یہ حالت ہو گئی، کہ کاروبار سلطنت مین خلل پڑنے لگا، اوس وقت وہ تفریح کے بہانہ سے کچھ دنون کے لئے باہر چلا گیا، راستہ مین ایک تالاب پر ایک سنہرے پَر والا ہنس نظر آیا، راجہ نے اس عجیب وغریب پرند کو پکڑ لیا ہنس نے اپنی رہائی کے لئے بڑی آہ وزاری کی، (یہ بیان اس قدر رقت انگیز ہے کہ سنگ دل بھی اس کو پڑھکر بغیر آنسو بہائے نہین رہ سکتا،) اسکی آہ وزاری پر راجہ نے اس شرط کے ساتھ اسے رہا کیا کہ وہ نل کا خط دمینتی کے پاس پہونچا دے گا، ہنس نے خط پہونچا دیا، اور نل کے حسن وجمال کی اس قدر تعریف کی کہ دمینتی بھی نل پر عاشق ہو گئی، اس کو غش آگیا، اور وہ نل کے عشق مین دن رات مغموم اور بے چین رہنے لگی، بھیم نے لڑکی کی یہ حالت دیکھ کر اس وقت کے دستور کے مطابق شوہر منتخب کرنے کے لئے سُویمبر کا انتظام شروع کیا،

یہان تک فیضی کا بیان خفیف اختلاف کے ساتھ اصل کتاب کے مطابق ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ اوس نے ودربھ کو بندر، دمینتی کو دمن اور نشدھ کو اُجین لکھا ہے، جو کوئی ایسا

فرق نہین ہے،

اس کے بعد اصل کتاب مین ہے کہ دمینتی کے سویمبر کی خبر دیولوک (جہان دیوتا یا فرشتے رہتے ہین) مین بھی پہنچ گئی اور چار دیوتا، اندر، ورن، یم اور اگنی بھی دمینتی سے شادی کے امید وار ہوئے اور اس مقصد سے وہ ودربھ کو روانہ ہوئے، دوسری طرف سے نل بھی اسی طرف چلا راستہ مین دونون مین مڈبھیڑ ہو گئی، نل کی خوبصورتی دیکھکر دیوتاؤن کے ہوش اُڑ گئے، اور اُن کو یقین ہو گیا کہ اس کی موجودگی مین ہم لوگون کو کامیابی نہ ہو گی، اس لئے انھون نے کسی تدبیر سے نل پر یہ زور ڈالا، کہ تم ہم لوگون کی شادی کا پیام لیکر دمینتی کے پاس جاؤ، نل نے اخلاقی فرض سمجھکر طوعاً وکرہاً اسے منظور کر لیا، اور سویمبر سے پہلے دمینتی کے پاس پہونچکر دیوتاؤن کا پیغام سنایا، گو نل خود اس کا عاشق تھا، مگر فرض کے خیال سے اس نے ہر طرح دمینتی کو دیوتاؤن کے ساتھ شادی کرنے کے لئے سمجھایا، مگر دمینتی نے ایک نہ سنی، وہ سوائے نل کے کسی کے ساتھ شادی کرنے پر تیار نہ ہوئی،

اس مقام پر شاعر نے نل کے اخلاقی معراج کا کمال دکھایا ہے، اس نے محض اخلاقی فرض کی خاطر قربانی کی کتنی زبردست مثال پیش کی ہے،

جب نل نے دمینتی کو دیوتاؤن کی خلاف ورزی کا بہت خوف دلایا، تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اور خودکشی کرنے کے لئے آمادہ ہو گئی، اس وقت نل سے نہ رہا گیا، فرض کی ادائگی پر جذبہ عشق غالب آگیا، اسے اپنے اوپر اختیار نہ رہ گیا، اور بے اختیاری مین دمینتی پر ظاہر کر دیا کہ مین ہی نل ہون، اس پر دیوتا ناخوش ہونے کے بجائے نل کی راستبازی اور خلوص نیت پر بہت خوش ہوئے، اور اس وقت اپنے اپنے مقام کو واپس چلے گئے،

لیکن پھر انھون نے دمینتی کو حاصل کرنے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی کہ وہ سویمبر کی تقریب مین پہونچ گئے، اور نل کی صورت وشکل اختیار کر لی، کہ اس طریقہ سے دمینتی دھوکے مین آکر ان مین سے کسی

کسی کے گلے مین رضامندی کا ہار ڈال دے،

اس حصہ کو شاعرانہ حیثیت سے علماے سنسکرت "نیشدہ چرت" کا بہترین حصہ سمجھتے ہین جس مین شاعر نے جادو بیانی اور جذبات کی ترجمانی کی انتہا کر دی ہے،

دیوتاؤن کی اس تبدیل شکل سے دمینتی بڑی کشمکش مین پڑ گئی، کہ ان مین سے اصل نل کون ہے، اور وہ کس کے گلے مین ہار ڈالے، آخر مین اس کشمکش سے پریشان ہو کر زار و قطار رونے لگی، اس کی اس دردانگیز حالت پر دیوتاؤن کو رحم آگیا، اور انھون نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ نقلی نل ہین، اور دمینتی نے اصلی نل کو پہچان کو اوس کے گلے مین ہار ڈال دیا، اور دونون کی شادی ہو گئی، اور دیوتا انھین آشیرباد (دعا) دے کر چلے گئے،

فیضی کے ترجمہ مین نل اور دمینتی کی شادی کا تذکرہ ضرور ہے، مگر اس مین یہ واقعات نہین ہین، بلکہ شادی کے بعد قماربازی مین نل کے سلطنت ہارنے، اس کے جلاوطن ہونے، راستے مین طرح طرح کی تکلیفین اور مصائب جھیلنے اور دمینتی کو سوتے ہوئے چھوڑ کر چلے جانے کا ذکر ہے، پھر ان کے ملنے کا بیان ہے، ان واقعات مین گو افسانویت بہت زیادہ ہے، مگر اصل کتاب مین جو اس وقت موجود ہے یہ واقعات بالکل نہیں ہیں،

لیکن اس تصرف مین فیضی کا کوئی قصور نہین ہے، عام طور سے راجہ نل کی کہانی قریب قریب اسی طرح بیان کیجاتی ہے، چنانچہ آغا نسیم لکھنوی لکھتے ہین :-

راجہ نل سلطنت ہے ہارا ۔۔۔ پانسہ کی بدی ہے آشکارا

اس لئے انہی مشہور واقعات کو فیضی نے بھی نظم کیا،

اس زمانہ مین بھی عام طور پر یہی واقعات مانے جاتے ہین، چنانچہ تقریبًا تیس سال ہوئے بمبئی کر "نیشدہ چرت" کا ایک ہندی ترجمہ شائع ہوا تھا، اسکی تمہید مین بھی مترجم نے نل کے متعلق انواع

اقسام کے مصائب جھیلنے اور دمینتی کو سوتے ہوئے چھوڑ کر چلے جانے اور پھر ان کے ملنے کا ذکر کیا ہے،

اگر فیضی کو دمینتی کی شادی کے سلسلہ مین دیوتاؤن کا قصہ معلوم ہوتا اور وہ اسکو اپنے ترجمہ مین جگہ دیتا تو اخلاقی نقطۂ نظر سے اسکی مثنوی کا پایہ بہت بلند ہو جاتا کہ یہ واقعہ اس مثنوی کی جان ہے، اب ہم شری ہرش کی شاعری کے کچھ نمونے پیش کرتے ہین،

(۱) "خالق اکبر کو جب یہ خیال آتا ہو کہ راجہ نل کے جاہ وجلال کے سامنے آفتاب اور ماہتاب کا وجود بے کار ہے، تو وہ ان دونون کے گرد آسمان پر حلقے کھینچ دیتا ہے، (وہ ہالے کے اندر ہو جاتے ہین)

اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے، کہ نل کے ہوتے ہوئے ان کا بنانا بے کار تھا، لیکن بن چکے تھے، اسلئے ان کو مٹا دینے کے بجائے ان کے گرد حلقہ کھینچ دیا،

تخیل کی انتہائی بلندی ہی،

۲۔ رقت انگیز کلام کا نمونہ :-

جب نل نے زرین بال ہنس کو پکڑا تو اوس نے روتے ہوئے کہا :-

"مین اپنی ضعیف مان کا اکلوتا بیٹا ہون میری بیوی نے ابھی بچہ جنا ہے، اسکی حالت اور بھی خراب ہے، ان دونون کا مین ہی ایک سہارا ہون، اے پروردگار : مجھ بیکس کو اس طرح اذیت دیتے ہوئے کیا تجھے کچھ رنج نہین آتا، (سرگ شلوک ۱۳۵)

اس شلوک کے بارہ مین یہ حکایت مشہور ہے، کہ ریاست گوالیار مین کوئی اہلکار سرکاری روپیہ کے غبن کے جرم مین قید ہو گیا تھا، وہ اپنے گھر کی افسوسناک حالت پر جو اتفاق سے

---

[1] اس تمثیل کی خوبی کا اندازہ اوس وقت ہو گا جب یہ پیش نظر ہو کہ اگلے زمانہ مین جب کتابین قلمی ہوتی تھین، پنڈت لوگ بدنمائی کے خیال سے غلط الفاظ کو کاٹتے نہ تھے، بلکہ ان کے گرد ایک حلقہ بنا دیتے تھے،

بالکل اسی ہنس کی حالت کے مطابق تھی، یہی اشلوک روزانہ پڑھ پڑھ کر رویا کرتا تھا، ایک دن مہاراجہ سیندھیا نے جیل کا معائنہ کرتے ہوئے اسے سُن لیا، تو وہ اتنا متاثر ہوئے کہ اُسی وقت اس کو رہا کر دیا، اور خلعت بھی عطا کیا،

(۳) نازک خیالی دمینتی کے حسن کی تعریف

معلوم ہوتا ہے دمینتی کے جمال رُخ کی ضیا کیلئے خالق نے ماہتاب کو نچوڑ کر اس کا عرق نکال لیا ہے، اسی سے بیچ مین سوراخ ہو جانے سے اسکے اندر آسمان کا کچھ نیلا پن دکھلائی دیتا ہے، (سرگ ۲ شلوک ۲۵)

(۴) ہنس دمینتی سے کہتا ہے:۔

"نل کے چہرہ کی تعریف سُن کر چاند شرم سے کبھی سورج کے پیچھے اور کبھی بادلون مین چھپ جاتا ہے، اور کبھی سمندر مین کود پڑتا ہے، (غروب ہو جاتا ہے)"

(سرگ ۳ شلوک ۳۳)

(۵) ہنس نے دمینتی سے نل کی تعریف کرکے کہا مین نے سنا ہو کہ خدا نے نل ہی کو دمینتی کے شوہر ہونے کے لئے بنایا ہے، اس بارہ مین تم کیا کہتی ہو؟ دمینتی اس کے جواب مین کہتی ہے:۔

"جس تمنا کو دل ہی نہیں چھوڑتا (کیونکہ وہ اس مین جاگزین ہوگئی ہے) وہ اوپر حلق مین کیونکر آسکتی ہے، کہ مین اُوسے زبان سے ادا کرون"۔ (سرگ ۴ شلوک ۴۵)

(۶) شب فراق مین چاند بھی تکلیف دہ ہو جاتا ہے، ع

دھوپ سے بھی ہے شب فرقت میں بدتر چاندنی

دیکھئے دمینتی اندھیری رات مین تارون کو دیکھکر نل کے فراق مین ان کو کیا بتلاتی ہے؟

"چاند بہت سی بے قصور فرقت زدہ عورتون کو مار مار کر گناہ کا مرتکب ہوا ہے اس

کی پاداش مین وہ اندھیری رات پر (جو ایک کالے مہیب پتھر کے مانند ہے) آسمان سے پٹکا جاتا ہے، اور پاش پاش ہو کر (شب تار مین) آسمان پر ستارون کی شکل مین نظر آتا ہے"، (سرگ ۴ شلوک ۴۹)

(۷) دیکھئے شری ہرش نے معمولی گفتگو کو اپنی طرز ادا سے کس قدر پُرلطف بنا دیا ہے، دمینتی نل کو اپنے حرم مین یکایک دیکھ کر اسکے بے نظیر حُسن پر ششدر رہ گئی، پھر ایک لمحہ کے بعد ہمت کر کے اپنا آسن نل کی طرف بڑھا دیا، اور التجا کی،

"گو یہ آپ کے بیٹھنے کے قابل نہین ہے، پھر بھی از راہ عنایت تھوڑی دیر کے لئے اسکو زینت دیجئے"۔

اس التجا پر جب نل خاموشی کے ساتھ بدستور کھڑا رہا، تو دمینتی بولی:۔

"پھولون کی لطافت کے غرور کو توڑنے والے، آپ کے دونون قدمون کو آپ کا تحت نل کہان تک تکلیف دینا چاہتا ہے"، (یعنی آپ کب تک کھڑے رہین گے)

(سرگ شلوک ۲۴)

(۸) بہار کے رخصت ہو جانے کے بعد باغون کی جو کیفیت ہو جاتی ہے، اس حالت مین کس مقام کو آپ نے تبدیل کر دیا ہے"، (یعنی آپ کہان سے تشریف لائے ہین)

(سرگ ۸ شلوک ۲۴)

(۹) اگر آپ انسان ہین تو زمین بڑی خوش نصیب ہے، اگر دیوتا ہین تو دیولوک قابل فخر ہے، اگر آپ (تحت الثریٰ مین رہنے والے) ناگون (ایک قسم کی مخلوق) کے چشم و چراغ ہین، تو نیچے ہو کر بھی ناگ لوک (تحت الثریٰ) کس کے اوپر نہین ہے؟

(سرگ ۸ شلوک ۴۴)

(۱۰) اس زمین پر کس نے ایسا ثواب کمایا ہے، جس کے انعام میں آپ کے قدم خاک پر کمل

(نیلوفر) کی سی مالا بچھاتے جاتے ہیں" (سرگ ۸ شلوک ۴۰)

(۱۱) آپ کی بے نظیر صورت دیکھ کر میری آنکھیں تو اپنی زندگی کا پھل پا چکیں، اب ایسی عنایت

ہو کہ میرے کان بھی آپ کے کلام سے جو آب حیات ہے، سیراب ہو جائیں"

(سرگ ۸ شلوک ۵۰)

نل کا جواب بھی نہایت دلچسپ ہے، مگر بخوف طوالت ہم اُسے پورا نقل نہیں کرتے صرف

خلاصہ پیش کیا جاتا ہے،

"نل نے ان باتون کو سن کر اپنا نام اور پتہ کچھ نہین بتایا، بلکہ صرف یہ کہا کہ مین دیوتاؤن کی طرف

سے تمھاری شادی کا پیام لیکر آیا ہون اتنا اشارہ کر دیا کہ مین چندر بنسی نسل سے ہون، اس پر

دمینتی نے خاص انداز سے کہا خوب! کچھ تو آپ بتلاتے ہین، اور کچھ نہین بتلاتے، گفتگو کرنے کی اچھی

ہوشیاری آپ نے سیکھی ہے، اگر آپ اپنا نام نہ بتائین گے، تو مین بھی آپ کے سوالون کا جواب نہ دونگی

اس کے بعد دمینتی نے ایک اور لطیف ہتھیار استعمال کیا، اس نے کہا کیا آپ نہین جانتے کہ غیر مرد

کے ساتھ ایک عالی خاندان لڑکی کو اس طرح سے سوال و جواب مین دیر تک الجھائے رکھنا مناسب

نہین ہے،

نل یہ سن کر جھینپ گیا، اور کہا لعنت ہے مجھ پر کہ مین ایک قاصد کے فرائض کو بھی ٹھیک

طور سے انجام نہین دے سکتا، پھر نل کے اصرار پر دمینتی نے کہا کہ مین دیوتاؤن کی اس قدردانی کا

شکریہ ادا کرتی ہون کہ انھون نے مجھے بیاہنے کے قابل سمجھا، لیکن مین نل کی ہو چکی ہون، میرے

لئے اب دیوتاؤن کی کوشش فضول ہے، مین مر جاؤن گی، مگر دوسرے کا منہ نہین دیکھ سکتی، اس کے

انکار پر نل نے دیوتاؤن کی ناراضی کا بہت خوف دلایا، اس وقت دمینتی رونے لگی، اور بولی،

"اے سوز غم تو جا! میرے جسم کو جلا کر خاک سیاہ کر دے، اے فلک! دوسرون کی تمناؤن

کا خون کرنا تیرا ہمیشہ سے شیوہ رہا ہے، تو بھی میری روح کو نکال کر آسودہ ہو جا،

اے دل! آتش فراق سے جل کر تو کیون نہین نیست و نابود ہو جاتا، اگر تو لوہے کا

ہے تو بھی طپش سے تجھے گل جانا چاہئے، اگر لوہے کا نہین فولاد کا ہے، اس لئے

نہین گلتا، تو آخر ناوک عشق کا تو نشانہ بن رہا ہے، سمجھ مین نہین آتا، کہ تو کس چیز سے

بنا ہے اے کمبخت کیون نہین پھٹ جاتا، ؟

اے روح! تو کیون نکلنے مین دیر کر رہی ہے، کیا تجھے نہین سوجھتا کہ تیرا گھر جبان

تو بیٹھی ہے جل رہا ہے، تیری تساہلی دیکھکر حیرت ہوتی ہے، کیا اب بھی تجھے راحت

کی امید ہے، ؟

آہ کیا کرون موت نہین آتی، میرا محبوب میرے دل کو نہین چھوڑتا، اور میری روح

اس کے تصور کو نہین چھوڑتی، کیسی مشکل کا سامنا ہے"

اب وہ نل کو مخاطب کر کے کہتی ہے وہ نل نہین جو اس کے سامنے موجود ہے، اوس کو

تو وہ دیوتاؤن کا قاصد سمجھتی ہے، بلکہ اوس نل کو جس کو وہ اپنا دل دے چکی ہے،

"میرے دلبر! دمینتی کا قصہ تو ختم ہو چکا، وہ فنا ہو چکی، یہ خبر کیا تم بعد مین نہ سنو گے؟

اگر اس وقت تم کو مجھ پر رحم نہین آتا، تو میری خبر سنکر ہی اگر مجھے یاد کر لوگے، تو مین

ممنون ہون گی"

اس طرح روتے روتے اخیر مین کہتی ہے،

"میرا دل اب پھٹا چاہتا ہے، اے نل! اس کے شگاف کے راستے سے باہر نہ نکل جانا،

یہی میری آخری التجا ہے"

دمینتی کا یہ اضطراب دیکھکر نل سے نہ رہا گیا، وہ بے اختیار بول اٹھا، پیاری! جس کے لئے تو اتنی آہ و زاری کر رہی ہے، وہ نل یہی ہے، جو تیرے سامنے کھڑا ہے، کیا کرون پیغامبری کے فرض کے خیال سے مین نے اپنے آپ کو ظاہر نہین کیا تھا، لیکن تیری حالت دیکھکر میرا دل قابو سے باہر ہو گیا، مگر پھر فوراً اسکو یہ خیال آیا، کہ مین نے یہ کیا کیا، ؟ دیوتا لوگ مجھے کیا کہین گے؛ کاش میرا دل ندامت سے پھٹ جاتا، اور مین دیوتا ؤن کو اس کا خلوص دکھا دیتا"۔

اس راز کے فاش ہونے کے بعد دمینتی اس خیال سے کہ نہ جانے مین نے لاعلمی مین نل کی شان مین بیباکی سے کیا کیا باتین کہہ ڈالین، حجاب نسوانی مین غرق ہو گئی، اور شرم سے گردن نیچی کرکے خاموش ہو گئی،

نل نے ہر چند اس سے نظر اٹھانے کی خواہش کی، مگر اوس نے سر نہ اٹھایا، دمینتی کی سہیلی کو یہ اندیشہ ہوا، کہ نل کہین ناخوش نہ ہو جائے، اس لئے مسکرا کر کہا، آپ کی محبوبہ شرم کی وجہ سے خاموش ہو گئی ہے، آپ کچھ اور نہ سمجھئے گا"،

یہ بند محاکات کی کتنی سچی اور نیچرل تصویر ہے، اس سے اس زمانہ کی شریف زادیون کے اخلاق و سیرت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے،

اتنے نمونے اس بے مثل مثنوی کی شاعرانہ لطافتون کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہین، ہم نے انہی اشلوکون کو پیش کیا ہے، جو بالکل آسان و سہل ہین، ان اشلوکون کو قصداً چھوڑ دیا ہے، جنمین ہندو مذہب کی تلمیحات ہین، یا جن مین صنائع و بدائع زیادہ ہین، اسلئے کہ ان کا بغیر کافی شرح و بسط کے سمجھانا مشکل ہے،

تلخیص و تبصرہ

مسلمانون مین تبلیغ عیسائیت کی تدبیرین

"اپریل سنہ ۴۹ء کے مسلم ورلڈ مین ایک امریکن مشنری، جی ال تھنزلین نے مسلمانون مین تبلیغ عیسائیت پر ایک مضمون لکھا ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے، کہ عیسائی مشنری کو دوسری قومون کے مقابلے مین مسلمانون کو عیسائی بنانے مین کہان تک کامیابی ہوتی ہے، اور اس کے لئے آیندہ کیا تدبیرین ان کے پیش نظر ہین، گو یہ مضمون فطری نیش زنی سے خالی نہین ہے، لیکن تنقیص کے پردہ مین بھی بے اختیار بعض حقائق کا اعتراف قلم پر آگیا ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ کم از کم مسلمانون کے ساتھ ان کا طرز عمل کتنا بدل گیا ہے۔

گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے مغربی دنیا اور اسلامی ممالک مین جو گہرا رابطہ پیدا ہو گیا ہے، اسکی مثال گذشتہ تاریخ مین نہین ملتی، اس تعلق کی ابتدا مصر پر نپولین کے حملہ یعنی اٹھارہوین صدی سے ہوتی ہے، گو ہماری اور اسلامی ملکون کی سرحدین ہمیشہ سے ملی ہی ہین، لیکن ہمارے تعلقات کبھی خوشگوار نہین رہے، اور نہ ہم نے ایک دوسرے کو سمجھا، لیکن موجودہ دور کی عیسائیت اس صورت حال کو قائم رکھنے کے لئے تیار نہین ہے، اس دور مین نہ صرف ارکان اسلام کو پورے طور سے سمجھا گیا ہے، بلکہ اسلامی زندگی، تاریخ، تہذیب و تمدن وغیرہ مذہب اسلام کے ہر پہلو پر گہری نگاہ ڈالی گئی ہے، اور بہ نسبت پہلے کے اب حقیقت زیادہ واضح ہو گئی ہے، دنیا کے اکثر بڑے مذاہب مین بہت سی باتین مشترک ہین، خود اسلام کی باطنی کیفیت عیسائیت اور اسلام مین مشترک ہے، دونون مذاہب خالق اکبر کے

سامنے طاعت تسلیم و رضا، صبر و تحمل اور فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہین؛ آخرت کے بارہ مین بھی دونون کا عقیدہ مشترک ہے،

یہ امر مشتبہ ہو کہ مسلمانون مین تبلیغ عیسائیت کے سلسلہ مین ہم نے عام مسلمانون کی نفسی و ذہنی کیفیت کو اس طریقہ سے سمجھ لیا ہو کہ ان کے سامنے عیسائیت کے نظام اور اسکی نظری تعلیمات کو پیش کرنے کے بجائے ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی عملی تفسیر پیش کر سکین گے یا نہیں، مسلمانون مین تبلیغ عیسائیت کے اصولِ کار کا مسئلہ اس حیثیت سے چندان اہم نہین ہو کہ عیسائیت مسلمانون کو انسانی ربانی امور مین اپنے زاویۂ نگاہ پر لانے کے لئے کیا کوشش کر رہی ہو، بلکہ اس مسئلہ کا عملی حصہ بہت زیادہ اہم ہے، ہم صرف عیسائی مبلغین کے کام پر اکتفا کرتے ہین، اور ان مبلغین سے جنھون نے حضرت عیسیٰؑ کو مسلمانون کے سامنے پیش کرنا مقصد بنا لیا ہے، سوال کرتے ہین، کہ ہر عیسائی بہ حیثیت انسان اور بہ حیثیت حکومتِ الٰہی کے منادی کے اس بلند طرزِ زندگی اور بلند تر نصب العین کو جسکا ہم تنہا اپنے کو مالک سمجھتے ہین، کس طرح مسلمانون کے سامنے پیش کرتا ہو جس سے حضرت عیسیٰؑ کی ذات ان کے سامنے مکمل انسانی زندگی کے نمونہ مین متشکل نظر آئے،

تصورات اور نظریات پیش کرنا بہت آسان ہے، لفظ عیسائیت ایک تصور ہے، لفظ اسلام بھی اسی کی ایک مثال ہو، پانچ حرفون کا یہ لفظ کس اختصار و جامعیت کے ساتھ مسلمانون کے سامنے وہ سب کچھ پیش کر دیتا ہو جس سے اسلام عبارت ہو،

اسلام بھی خدا کی طاعت تسلیم و رضا اور نفس کشی کا مظہر ہے، اسکی منطق بھی مکمل ہے، لیکن ہمارا مجموعۂ قوانین اس کہین زیادہ بلند ہے، وہ ایک ما فوق الانسانی مجموعۂ قوانین ہے، لیکن جہانتک اخلاص اور جان سپاری کا تعلق ہے، مسلمان اکثر اس کا بلند نمونہ پیش کرتے ہین، گو بلند نقطۂ نظر سے ہمارا معیارِ زندگی، ہماری اخروی امیدین اور مسرتین، زیادہ بلند ہین، لیکن حصولِ کمال یا کم از کم وہان تک

پہونچنے کے لئے ہمارے مقابلہ مین مسلمانون کا طریقہ زیادہ عملی و قابلِ عمل ہو، جس کا ثبوت اکابر مسلمانون کے سوانح سے ملتا ہو، مثلاً بابر اور جہانگیر گو اسلام کا صحیح نمونہ نہ تھے، لیکن ان کی سوانح عمریان (تزک) اپنے خدا کی بعض حقیقی صفتون پر ان کے غیر متزلزل ایمان و اثر کا اظہار کرتی ہین، مجھے کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے، کہ روحانی تکمیل کے لئے اسلام مین ایسے آئین و اصول ہین، جن پر اسی نوع کے عیسوی اصولون کو فوقیت حاصل نہین ہے،

ان باتون سے ہمین یہ سبق حاصل کرنا چاہئے، کہ مسلمانون مین تبلیغِ عیسائیت کے لئے ہمین کونسی مناسب تدبیرین اور طریقے اختیار کرنے چاہئین، اگر ہم از سرِ نو کام شروع کرین تو مسلمانون کی قلب و دماغ اور روح تک پہونچنے کے لئے ہمین کون سا راستہ اختیار کرنا ہوگا،

اس سلسلہ مین ہمارے لئے مسلمانون کے طریقۂ تبلیغ اور ان کی ہوشمندانہ تدبیرون کا مطالعہ کرنا مفید ہوگا، میدانِ جنگ مین سپہ سالار اور معمولی سپاہی کسی کو بھی دشمن سے مفید سبق لینے مین عار نہ ہونا چاہئے، ہمارے لئے ایک بڑی مشکل یہ ہو کہ ہمارے مبلغین اپنے مادی اور روحانی مرکز سے بہت دور بھیجدئے جاتے ہین، اس دوری کی وجہ سے وہ اجنبی مقامون پر کچھ زیادہ مفید نہین ثابت ہوتے، لیکن اس مشکل کا کوئی حل نہین ہے، اور ہماری تبلیغی فوج اس سے زیادہ متحرک نہین ہو سکتی،

آشرم کے تخیل اور اوس کے طریقہ کار پر جس کی بنیاد خالص اسلامی خیالات و جذبات پر ہے، مدتون سے ڈاکٹر اسٹینلی جون اور بعض دوسرے مبلغین کا عمل ہے، اس طریقہ سے پروٹسٹنٹ مبلغین کے حلقہ مین ایسی جماعتین بھی شامل ہو جائین گی، جو رومن کیتھولک چرچ کی خالص مذہبی خدمات کی طرح مبلغین کیلئے نہایت مفید ثابت ہون گی،

مسلسل تجربات سے اب یہ بات یقین کی حد تک پہنچ گئی ہے، کہ مسلمانون مین عیسائیت کی تبلیغ کے لئے نہ صرف پروٹسٹنٹ کو تنہا اپنا گھر سنبھالنا ہے، کیونکہ مسلمانون مین تبلیغ کا کام نہایت دشوار ہے

اور اس کے نتائج بالکل ناقابلِ اعتبار ہین) بلکہ مختلف کلیساؤن کو پوری توجہ فیاضی اور ہوشمندی کے ساتھ اس مہم کو قائم رکھنا ہی،

زنانہ تبلیغی جماعتون نے اپنے کام مین حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے، لیکن ان کے کام مین ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ انھون نے اسلام کی نظری اور عملی تعلیمات کو متوازن طریقہ سے نہین پیش کیا ہی، اگر وہ یہ نہ محسوس کرین گی کہ مسلمان بہت سی باتون مین بالکل ہماری طرح ہین، اور ان کیساتھ ان کا طرزِ عمل غیر مساویانہ ہوگا، تو ان کا یہ طریقہ مسلمانون مین تبلیغ کے لئے خطرہ سے خالی نہ ہوگا، کیونکہ مسلمان ان کے نسلی، اور اس سے بھی زیادہ محض خیالی اخلاقی تفوق کو گوارا نہ کرین گے،

کیا عیسائی دنیا مین کبھی وہ زمانہ آئے گا جب عام عیسائی ہمارے عقیدہ اور مقصد کے سچے مبلغ بنین گے، اور ان مین خدا کی حکومت قائم ہو گی، کیا ہمارے طبقہ، عوام مین وہ نظانت نہین ہے، جو غیر عیسائی یا دوسرے نظامون مین پائی جاتی ہے، اگر اسلام قولاً وعملاً عیسائیت کے قریب نہین آتا، تو ہم کیون پرستارانِ توحید کو اپنے حلقہ مین لانے کی کوشش سے باز رہین، کیا ہمارے پاس ذرائع نہین ہین، یا تدبیر و طریقہ رکار سے واقفیت نہین رکھتے، یا ان کو استعمال کرنا نہین چاہتے، یا انھین صرف اپنی حدود تک محدود رکھنا چاہتے ہین،

مسلمانون مین عیسائیت کی تبلیغ کی رکاوٹ بڑی حد تک خود ہمارے مذہب کا معیار اور اس کا بلند مجموعہ قوانین ہے،

اسلام کی طرح عیسائیت نے دقیق قوانین وضع نہین کئے، اور پروٹسٹنٹ کی بہ نسبت اسلام مین عقلی و اخلاقی مسائل و قوانین کا اتنا احاطہ ہو کہ ان چیزون مین خود مسلمانون کے لئے انتخاب کی گنجایش باقی نہین ہے، اور وہ اسی کے عادی ہین، اس لئے ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے، کہ حق و

لے معارف اس حربہ کے مقابلہ مین بہت قومین اپنا دین و ایمان بچا سکتی ہین،

انصاف کے مطابق قانونِ اخلاق کے زیادہ سے زیادہ کتنے ارکان ہو سکتے ہین، جو مسلمانون کو حلقہ عیسائیت مین لانے کے لئے ضروری ہین، عیسائی قوانین صرف قید و بند عائد کرتے تھے، اسلامی قانون گو عجب متلون اور غیر مستقل معلوم ہوتا ہے، اس کے باوجود اس مین فقہی ورسمی تفصیلات بہت ہین، جو فطرت انسانی کے لئے بڑی مراعات پیش کرتی ہین،

اسلام کی شریعت پرستی کے مقابلہ مین عیسائیت کی آزادی کو دیکھکر ایک نو عیسائی کے دماغ مین جو انتشار پیدا ہوتا ہے، وہ اتنا اہم اور پریشان کن ہوتا ہے، جس کا ہم لوگ اندازہ بھی نہین کر سکتے، مسلمان اپنا مذہب چھوڑنے کے بعد بھی اس کے مقررہ نظام اور اس کے قانون کی وہ باریکیان نہین بھولتے، جن مین وہ گھرے ہوئے تھے، ایسی حالت مین کوئی شبہہ نہین کہ ان نو عیسائیون کی بعض اخلاقی کمزوریون کا سبب دین عیسوی مین مذہبی و اخلاقی قوانین کی عدم موجودگی اور اس کی ظاہری بے اصولی ہوتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہو کہ عیسائی مذہب مین مذہبی قوانین کی جزئیات کی کمی کی وجہ سے ان کے انتخاب مین ان نو عیسائیون کی رہنمائی نہین ہوتی، یہ چیز خاص طور سے ملحوظ رکھنے کے قابل ہو کہ بہت سے ایسے طور و طریقے جنھین ہم عیسائی قبول کرتے ہین نو عیسائیون کے علم مین آنے کے قابل نہین ہین، اسکی وجہ سے بہت سے ہونہار عیسائی تباہ ہو گئے، دوسرے مذاہب کے نو عیسائیون کے مقابلہ مین اسلام سے آئے ہوئے نو عیسائیون کے ساتھ کہین زیادہ محبت اور توجہ کی ضرورت ہو،

اس امر مین شبہہ کرنا کہ آیندہ مسلمانون کی بڑی تعداد عیسائیت قبول کرے گی، اس صداقت کی قوت پر شبہہ کرنا ہو جو دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجی گئی تھی، ایک زمانہ مین یروشلم کے کلیسا کو شبہہ تھا کہ بحر روم کے آس پاس کی رہنے والی مشرک قومین بھی کبھی عیسائیت قبول کرین گی، اسی طریقہ سے جنوبی یورپ کے کلیسا کو شک تھا، کہ کبھی شمال کی وحشی قومین بھی عیسائیت کی طرف متوجہ ہون گی، ایک زمانہ تک پروٹسٹنٹ ممالک جرمنی، انگلستان، اسکاٹ لینڈ، ہالینڈ اور اسکانڈنیویہ کو کبھی اس کا خیال بھی نہ آیا، کہ

وہ افریقہ، ہندوستان اور مشرقی ایشیا مین بسنے والی قومون مین شمعِ صداقت روشن کرین، لیکن ان علاقون پر تبلیغ عیسائیت نے اس روحانی اور دماغی جمود کا خاتمہ کر دیا، اسی طریقہ سے ایک زمانہ وہ بھی آئے گا، جب یہ وہم بھی کہ مسلمان کبھی عیسائی نہین ہو سکتے، دوسرے خرافات کی طرح ختم ہو جائے گا، مجھے یقین ہے کہ ان واقعات کے اثرات مشرق قریب، ہندوستان اور شمالی افریقہ کے کلیساؤن پر بہت شدید ہون گے، اگر عیسائیت کی تلقین اور مثال سے گاندھی اور چانگ کائی شیخ اور دوسرے چینی رہنما پیدا ہو سکتے ہین، تو پھر اس کی تبلیغ سے آیندہ دنیا پر کیا کچھ اثر نہ پڑے گا،

(ن ص)

سینما اور ریڈیو کی ذہنی مضرتین

جدید تمدن کی تیز رفتاری اور جلد بازی نے افکار و خیالات پر غور و فکر کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے، آج کی مشغول دنیا کے پاس اتنا وقت نہین ہے کہ وہ کتابون کے افکار و خیالات پر غور و فکر کیلئے وقت نکال سکے، اس لئے جو مقصد کافی غور و فکر کے بعد حاصل کیا جاتا تھا، وہ سینما اور ریڈیو کے ذریعہ چند گھنٹون یا اس سے بھی کم مین حاصل ہو جاتا ہے، لیکن اب خود علماے یورپ اس جلد بازی اور عجلت کو تہذیب کے لئے خطرہ سمجھنے لگے ہین، چنانچہ فرانس کے ایک مشہور صاحب قلم مفکر جارج ڈومیل نے اپنی ایک تازہ تصنیف مین اس مسئلہ پر مستقل ایک باب لکھا ہے، اس مین وہ لکھتا ہے، کہ تہذیب کی دو قسمین ہین، ایک اعلیٰ اور ترقی یافتہ تہذیب جس کی بنیاد پڑھے ہوئے الفاظ یعنی کتابون کے مطالعہ اور غور و فکر پر ہو، دوسری ادنیٰ تہذیب جو ہمارے کانون مین ڈالی جاتی ہے، اور ہماری نگاہون کے سامنے (ریڈیو اور سینما) پیش کیجاتی ہے، ترقی یافتہ تہذیب ہر معاملہ مین کافی غور و تامل چاہتی ہے، جو کتابون سے حاصل ہو سکتی ہے اور جن کا اطمینان و سکون کے ساتھ مطالعہ

کیا جا سکے، اور یہ چیز سینما کے پردون اور ریڈیو کی موجون مین ناپید ہے، کہ ان کے تلوّن اور سرعت رفتار کی وجہ سے نہ ان پر تنقید کا موقع ملتا ہے، نہ غور و فکر کا، ایسی حالت مین جب وہ وقت آئیگا جب ہر گھر ریڈیو کا تماشا گاہ بن جائے گا، تو غور و فکر کے فقدان کی وجہ سے ساری دنیا ایک قسم کے فکری تعطل و اضمحلال مین مبتلا ہو جائے گی، اور انسانون سے افکار و خیالات پر بحث و تنقید کا مادہ جاتا رہے گا، اور وہ اچھے برے اور غلط و صحیح مین امتیاز نہ کر سکین گے، دوسری خرابی یہ ہے، کہ سینما اور ریڈیو کی پیش کردہ چیزون مین انتخاب کا موقع نہین ہے کہ پسندیدہ چیز کو قبول اور ناپسندیدہ کو رد کیا جا سکے، سارے انسان ایک ہی چیز کو سنتے، اور قبول کرتے ہین، اس لئے سب کے ذوق کی نشو ونما ایک ہی نہج پر ہوتی ہے، اور ان کے ذہن ایک ہی قالب مین ڈھل جاتے ہین، ان مین کوئی فکری تنوع باقی نہین رہتا، اور وہ انسانون کا ایسا گلہ بن جاتے ہین، جو ذہن اور شعور کی جلا دینے والی تہذیب کو نہین چاہتا، اور صرف فوجی احکام کو سنتا ہے، اور اطاعت کرتا ہے، ریڈیو اور سینما کے مقابلہ مین کتابون اور رسالون مین تنوع اور غور و فکر کا میدان بہت وسیع ہے، اور ایک انسان غور و فکر کے بعد ان چیزون کا انتخاب کر سکتا ہے جس کے بغیر ترقی یافتہ اور مہذب زندگی حاصل نہین ہو سکتی، ریڈیو اور سینما کے ان نقائص کی بنا پر اس مصنف کا خیال ہے کہ انسانی تہذیب کا مستقبل کتابون سے وابستہ ہے اور چونکہ موجودہ دور کی جلد بازی اور عجلت پسندی کی وجہ سے عام رجحان کتابون کو فکر و تدبر سے پڑھنے کے بجائے سینما اور ریڈیو کے ذریعہ حصولِ معلومات کی طرف ہے، اور وہ "سطحی اخباری تہذیب" اور "سوچی سمجھی ہوئی ٹھوس اور پختہ تہذیب" مین کوئی فرق نہین کرتے اسلئے فکری اور ذہنی اعتبار سے انسانون کا مستقبل بہت خطرناک ہے،

(م)

اخبارِ علمیہ

الم چھٹا حاسہ ہے

اب تک صرف پانچ حواس مانے جاتے تھے، جو حواس خمسہ کے نام سے مشہور ہین، لیکن سارٹن یونیورسٹی کے پروفیسر ہنری ہیرن کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ "الم" چھٹا حاسہ ہے، اور دوسرے حواس کے مقابلہ مین اس کا احساس بہت سست رفتار ہے، مثلاً "لمس" کا احساس جلد سے دماغ تک چالیس میٹر فی سکنڈ کی رفتار سے پہنچتا ہے، اس کے مقابلہ مین "پن" کے چبھنے کا احساس سولہ میٹر فی سکنڈ "دبنے" کا احساس بارہ میٹر فی سکنڈ اور "جلنے" کا ۴½ میٹر فی سکنڈ کی رفتار سے دماغ تک پہنچتا ہے، یعنی الم مین جتنی شدت ہوتی جاتی ہے، اتنے ہی احساس کی رفتار سست پڑتی جاتی ہے،

دوسرے حواس کی طرح محسوسات دماغ تک پہنچانے کے لئے "الم" کے بھی خاص اطراف اعصاب اور عصبی ریشے ہین، جو الم کے احساس کو دماغ تک پہنچاتے ہین، ہاتھ پر معمولی دباؤ صرف "لمس" کا احساس پیدا کرتا ہے، پھر یہی دباؤ سخت ہو کر الم کا احساس بنجاتا ہے، برف کا چھوٹا ٹکڑا جسم پر مس ہونے سے پہلے صرف لمس کا احساس پیدا ہوتا ہے، پھر ٹھنڈک اور آخر مین الم کا، لیکن ان تینون مدارج کا احساس کرنے والے اعصاب جدا جدا ہین، مثلاً سخت دباؤ کا جو الم کے درجہ تک پہونچ جائے، احساس کرنے والے عصبی ریشے ان عصبی ریشون کے علاوہ ہین، جو معمولی دباؤ مین محض لمس کا احساس کرتے ہین، اسی طریقہ سے برف کی معمولی ٹھنڈک کا احساس ان ریشون

کے علاوہ دوسرے ریشون کے ذریعے دماغ تک پہونچتا ہے، جو ٹھنڈک کے الم کو پہنچاتے ہین،

اس موضوع پر تحقیق کرنے والون نے اس حیثیت سے نظام اعصاب کا مطالعہ کرنے مین کہ مختلف قسم کے احساسات کو منتقل کرنے والے عصبی ریشے مختلف ہین، کوکین کے اثرات پر اعتماد کیا ہے، انکے تجربات سے ظاہر ہوا کہ جسطرح الم کا احساس سب سے آخر مین ہوتا ہے، اسی طرح وہ سب سے پہلے ختم بھی ہوتا ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب دانتون کا طبیب مسوڑھون کو کوکین کا انجکشن دیتا ہے، تو سب سے پہلے گڑنے اور چبھنے کا احساس ختم ہوتا ہے، حالانکہ طبیب کی انگلیون کے دباؤ کا احساس باقی رہتا ہے، اگر انجکشن دینے کے فوراً بعد عصبہ کی تشریح کیجائے تو معلوم ہوگا، کہ سب سے نازک ریشے ہی کوکین کے اثرات سے متاثر ہین، تھوڑی دیر کے بعد جب مخدر کا اثر دوسرے ریشون تک پہنچتا ہے اس وقت گرمی اور ٹھنڈک کا احساس ختم ہوتا ہے، تشریح سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو ریشے لمس کے احساس کے لئے مخصوص ہین، وہی سب سے زیادہ سخت ہین، علماے تشریح نے جسم انسانی کا ایک ایسا نقشہ بنانے کی کوشش کی تھی، جس مین سطحِ جسم کے تمام اطرافِ اعصاب، اور جو احساسات کو منتقل کرنے کے لئے مخصوص ہین، نمایان ہون، اس کوشش مین یہ معلوم ہوا کہ انسانی جسم مین ان اطراف کی تقسیم مساوی نہین ہے، مثلاً آنکھ کے بیرونی شفاف پردہ مین وہ اطراف اعصاب نہین ہین جو ٹھنڈک اور لمس کو محسوس کرتے ہین، بلکہ صرف ان اطراف کا جال ہے، جو محض الم کو محسوس کرتے ہیں، اس کے برعکس گال کے اندرونی حصہ مین داڑھ کے قریب ایک حصہ ہے، جس مین الم محسوس کرنیکے اطراف نہین ہین، لیکن وہ اطراف موجود ہین جو لمس اور ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہین،

اس موضوع پر تحقیق کرنے والے علماء کا بیان ہے کہ انسانی جسم کی سطح پر گرمی کا احساس کرنیوالے مرکز اور نقطے سولہ ہزار، ٹھنڈک کا احساس کرنے والے ایک سو پچاس ہزار، لمس کا احساس کرنے والے دس لاکھ اور الم کا احساس کرنے والے تین ملین سے چار ملین تک ہین،

لوہے اور شیشے کے دل

شیشے اور پتھر کے دل کا وجود اب تک صرف شاعری کی دنیا مین تھا، لیکن سرجری کی ترقی نے اسے واقعہ بنا دیا ہے، اعضاے رئیسہ مین سب سے نازک عضو دل ہے، اسلئے قلب اور حوالی قلب کے امراض کا علاج آپریشن سے بہت نازک ہے، اور بڑے بڑے ماہر سرجن اسے چھوتے ہوئے ڈرتے ہین، بلکہ ان اعضاء کے آپریشن مین بھی جن کا دل سے زیادہ تعلق ہے، اور جن کے چھیڑنے سے قلب کے فعل پر اثر پڑتا ہے، کبھی کبھی قلب کی نزاکت کی وجہ سے موت ہو جاتی ہے، اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے مین پنسالونیا یونیورسٹی امریکہ کے ڈاکٹر جان جیون نے مصنوعی پھیپھڑے کی طرح لوہے کا ایک دل بنایا ہے، او بلیون پر اس کا تجربہ کیا، ان کے دل نکال کر لوہے کے دل لگا دیے، یہ دل اصلی دل کی طرح اپنا فعل انجام دیتے رہے، چنانچہ ان مین سے اکثر بلیان ایک سال سے زیادہ زندہ ہین اور ان کے بچے بھی ہوئے، ڈاکٹر مذکور کا دعویٰ ہے کہ فی الحال یہ مصنوعی دل انسانون مین بھی بیس منٹ سے ایک گھنٹہ تک اصلی دل کے وظائف ادا کرسکتا ہے، اگر یہ تجربہ کامیاب ہو گیا، تو قلب اور اس سے قریبی تعلق رکھنے والے اعضاء کے آپریشن مین بڑی سہولت پیدا ہو جائیگی، آپریشن کے دوران مین یہ مصنوعی قلب اصلی قلب کے فرائض انجام دیتا رہے گا، اور اس کے فعل کے رُک جانے کا خطرہ جاتا رہے گا، اس سے پہلے ایک فرانسیسی ڈاکٹر کارل اور مشہور امریکن ہوا باز لینڈبرگ شیشے کے دل بنا چکے ہین، جن کے ذریعہ بعض غدود اور بافتین انسانی جسم سے الگ کرکے زندہ رکھی جاسکتی ہیں،

ایک تباہ کن ٹینک

اس کے مقابلہ مین انسانون کی ہلاکت اور دنیا کی بربادی کے سامان بھی اسی تیزی کے ساتھ

فراہم کئے جارہے ہین، چنانچہ حال مین ایک امریکن موجد نے حکومت سے بنانے کی منظوری حاصل کرنے کے لئے ایک ایسے ٹینک کا نقشہ پیش کیا ہے جسکی ہلاکت خیزی پوری ایک فوج کے برابر ہوگی، اس کا طول اسّی فٹ، عرض ستّر فٹ اور بلندی دس منزلہ عمارت کے برابر، وزن ایک ہزار ٹن اور رفتار سو میل فی گھنٹہ ہی، اس مین بڑی بڑی قلعہ شکن توپین نصب ہون گی، اس کے لئے خشکی و تری پستی و بلندی میدان و صحرا سب برابر ہون گے، وہ معمولی دریاؤن کو عبور کرلیگا، سمینٹ کی سنگین سے سنگین عمارتین جو اسکی راہ مین آجائین، خاک کا ڈھیر اور جنگل کی خوفناک جھاڑیون کو روند کر بھوسا بنا دیگا، اسکی راہ مین کوئی چیز حائل نہ ہوسکے گی، اور اسکی ہلاکت خیزی ہر جگہ یکسان ہوگی، لیکن خود اس پر کسی چیز کا اثر نہ ہوسکے گا، توپ کے گولے اس سے ٹکرا کر سنگریزون کی طرح بکھر جائین گے، زہریلی گیس اس کے اندر نفوذ نہ کرسکے گی، اس متحرک آہنی قلعہ کو چلانے کے لئے صرف ایک آدمی کافی ہوگا، البتہ توپون کو چلانے کیلئے دس آدمیون کی ضرورت ہوگی، اس خطرناک ٹینک کا کوئی توڑ نہ ہوگا،

کیمسٹری میں امریکہ کا امتیاز

گذشتہ جنگ عظیم کے کچھ دنون بعد تک کیمسٹری مین جرمنی ساری دنیا مین ممتاز تھا، لیکن اب وہ سب سے آخری صف مین آگیا ہی، سب سے اول نمبر امریکہ کا ہی، اسکے بعد برطانیہ، سب سے آخر مین جرمنی، یہ نتیجہ کیمسٹری کی جدید تحقیقاتون سے نکلتا ہی، گذشتہ سال ۵۰۰۰ کیمیاوی مسائل زیر تحقیقات تھے، جن مین سب سے زیادہ حصہ امریکی علماء کا تھا، اس وقت برطانوی اور امریکی رسالون مین ۴۰ فی صدی خاص کیمیاوی رسائل ہین، گذشتہ پانچ برسون مین امریکہ مین جو کیمیاوی ایجادات پیٹنٹ کرائی گئی ہین، وہ اس سے پہلے کے پانچ برسون کے مقابلہ مین ۱۵ فیصدی زیادہ ہین، اسکے مقابلہ میں برطانیہ کی کیمیاوی ایجادات بائیس فیصدی فرانس کی ۳۲ فیصدی اور جرمنی کی ۳۰ فیصدی گھٹ گئی ہین، البتہ روس جاپان اس میدان مین بہت آگے بڑھ رہے ہین،

(م)

مطبوعات جدیدہ

سوشلزم کی بنیادی حقیقت اور اسکی قسمین

مترجمہ جناب سید مفتی الدین صاحب شمسی، رفیق ندوۃ المصنفین تقطیع بڑی، ضخامت ۲۳۶ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ: ندوۃ المصنفین، قرولباغ، دہلی۔

اردو مین اشتراکیت جیسے اہم اور عالمگیر مسئلہ پر مستقل اور مستند لٹریچر بہت کم ہے، جناب مفتی الدین صاحب نے اس مفید کتاب کا ترجمہ کرکے وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے، آج سے تیس سال پہلے ایک جرمن پروفیسر کارل ڈیل نے بعض جرمن یونیورسٹیون مین اشتراکیت، اشتمالیت، اور فوضویت وغیرہ پر بیس تقریرین کی تھین، جو اسی زمانہ مین کتابی شکل مین شائع ہوگئی تھین، فاضل مترجم نے ان مین سے آٹھ تقریرون کا جو اشتراکیت، اشتمالیت، فوضویت اور بعض دوسرے اشتراکی پہلوؤن پر ہین، ترجمہ کیا ہے، گو ان تقریرون پر تیس سال کا زمانہ گذر چکا، اور اس مدت مین اشتراکیت بہت آگے بڑھ چکی ہے اور نظری اشتراکیت عملی شکل اختیار کر چکی ہے، لیکن اسکی حقیقت اور اسکی تاریخ کو سمجھنے کے لئے یہ تقریرین بالکل کافی ہین، درمیانی مدت کے حالات کو فاضل مترجم کے مقدمہ نے پورا کر دیا ہے، یہ مقدمہ بجائے خود اشتراکیت کی تاریخ، روس کا اشتراکی انقلاب اور اس کے نظام پر جامع تبصرہ ہے، اصل کتاب مین آٹھ تقریرین ہین، اس مین اشتراکیت کے ابتدائی تصور یعنی ایک عادلانہ اور مساویانہ نظام کے تخیل سے لے کر اسکی آخری شکل موجودہ اشتراکیت تک اس کے تمام مدارج اقسام اور نظامون کی پوری تاریخ و تفصیل ہے، کہ اشتراکیت کی بنیادی حقیقت

کیا ہے، اس کا ابتدائی تصور کیا تھا، مختلف زمانون کے اشتراکی مفکرین نے اس کے کیا کیا نظریے، اصول اور نظام پیش کئے، اور ان سے کس طرح اشتراکیت، اشتمالیت، فوضویت اور ان کی شاخ در شاخ بہت سی شکلین پیدا ہوئین، اور ان مین باہم کیا فرق ہے، ان تمام نظریون اور نظامون کے محاسن و نقائص پر مصنف کی تنقید بھی ہے، آخری ابواب مین ازدواجی نظام اور مذہب کے بارہ مین اشتراکیت کے تخیل پر روشنی ڈالی گئی ہے، کہ نفس اشتراکیت ازدواجی نظام اور مذہب کی مخالف نہین، بلکہ بہت سے اشتراکی مفکر خالص مذہبی تھے، اور وہ اس کو مذہب کے منشا کی تکمیل سمجھتے تھے، یہ البتہ صحیح ہے کہ اشتراکیون کی ایک جماعت مذہب کے خلاف اور ایک غیر جانبدار ہے لیکن وہ بھی مذہب کے استیصال کے درپے نہین ہے بلکہ اوس کا خیال ہے کہ اشتراکیت کے فروغ کے بعد خود بخود مذہب مٹ جائے گا، اردو مین اس موضوع پر یہ بہت جامع کتاب ہے، اشتراکیت سے دلچسپی رکھنے والون کو ضرور اسکا مطالعہ کرنا چاہیے،

یورپ کی حکومتیں

(حصہ اول) مؤلفہ جناب ڈاکٹر نجم الدین صاحب جعفری و منظر انصاری صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۱۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ

پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی،

اس زمانہ مین جب کہ ہندوستان مین جمہوری نظام حکومت کی تشکیل کا سوال درپیش ہے، ایسی کتابون کی بڑی ضرورت ہے جن مین مختلف جمہوری حکومتون کے دستور اور ان کے جمہوری طریق حکومت کے متعلق معلومات ہون، اس ضرورت کو پیش نظر رکھکر فاضل مؤلفین نے یہ کتاب تالیف کی ہے، اس حصہ مین یورپ کی پانچ جمہوری حکومتون، برطانیہ، فرانس، اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کے دستورون اور ان کے طرز حکومت کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان ملکون مین جمہور کو حکومت مین کہان تک دخل ہے، اور وہ کس طرح اپنے ملک پر حکومت کرتے ہین، ہر حکومت کے

شروع میں اس کے دستوری ارتقار کی مختصر تاریخ بھی دیدی گئی ہے، جرمنی اور اٹلی کے دستور کے آخر میں ان کی موجودہ ڈکٹیٹرشپ کا بھی مختصر حال دیدیا گیا ہے، گو یہ ایک خشک سیاسی موضوع ہے، لیکن طرزِ تحریر اور دلچسپ واقعات کی آمیزش نے کتاب کی خشکی دور کردی ہے، سیاست کے ابتدائی سبق کے لحاظ سے ہر پڑھے لکھے آدمی کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے،

مکتوبات شاد عظیم آبادی

مرتبہ ڈاکٹر محی الدین زور قادری تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۹۹ صفحے، کاغذ اچھا کتابت وطباعت معمولی قیمت عہر، پتہ :- ادارہ ادبیات اردو رفعت منزل خیرت آباد حیدرآباد دکن،

شاد عظیم آبادی ان باکمالوں میں تھے، جن کی استادی کا سکہ نظم ونثر دونون اقلیمون مین رواں تھا، نظم کے تو وہ مسلم الثبوت استاد تھے ہی ان کی نثر مین بھی پرانے اور نئے طرز کی ملی جلی ہوئی ایک خاص قسم کی گھلاوٹ اور دلکشی ہے، انھون نے اپنے استاد زادہ ہمایون مرزا مرحوم بیرسٹر حیدرآباد اور انکی بیگم کے نام جو خطوط لکھے تھے، ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد نے انھین شائع کر دیا ہے، اس مین کل ۹۰ خطوط ہین، یہ خطوط مختلف حیثیتون سے دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہین، ان کی ادبی حیثیت کے علاوہ ان سے شاد کے ذاتی حالات، عظیم آباد کی پرانی ادبی صحبتین، شرفائے عظیم آباد کی معاشرت اور اس دور کے بہت سے دلچسپ تاریخی واقعات وحالات معلوم ہوتے ہین، غالب کی طرح شاد کی زندگی کا آخری دور بھی ناخوشگوار حالات مین گذرا جس کی جھلک ان خطوط مین موجود ہے، ان مین سب سے زیادہ نمایان ان کی تعلی اور اپنی مبالغہ آمیز مدح سرائی ہے، ان کا کلام شاعرانہ مبالغون سے بڑی حد تک پاک ہے، اس کمی کو ان خطوط نے پورا کر دیا ہے، جابجا ابنائے وطن کی شکایت سے قیاس ہوتا ہے، کہ یہ چیز عظیم آباد کے مقامی حالات کا نتیجہ ہے ورنہ اتنی غیر معتدل حد تک نہ ہوتی، ان خطوط مین ایک چیز خاص طور سے سبق لینے کے قابل ہے، انھون نے

ضعفِ پیری مین جب کہ تمام قوی جواب دیچکے تھے، جس ہمت ومحنت سے اپنے استاد حضرت فریاد عظیم آبادی کی سوانح عمری لکھی ہے، وہ ہمت نوجوانون کے لئے قابلِ رشک ہے، ادارہ ادبیات اردو نے ان خطوط کو شائع کرکے ایک باکمال کی ادبی یادگار محفوظ کردی،

ناموران اسلام

مرتبہ جناب مولوی محمد حسین حسان صاحب ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۶ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہر، پتہ :- جامعہ دہلی،

اس کتاب مین لائق مؤلف نے مختلف فنون کے علمار وائمہ خلفار وسلاطین وزرار وفاتحین صوفیار ومصلحین ہر طبقہ کے ساتھ اکابر اسلام کے مختصر حالات و کارنامے لکھے ہین، اکابرِ اسلام کی فہرست بہت طویل ہے، ان مین سے چند کا انتخاب بہت دشوار کام ہے، پھر ہر شخص کا ذوقِ انتخاب جداگانہ ہوتا ہے، تاہم مجموعی حیثیت سے مؤلف نے حسنِ مذاق سے انتخاب کیا ہے، اور ہر طبقہ کی مناسب نمایندگی کی پوری کوشش کی ہے، معلومات کے اعتبار سے کتاب بچون کیلئے مفید ہے، معمولی پڑھے لکھے اشخاص بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہین،

مغربی تصانیف کے اردو تراجم

مرتبہ جناب میر حسن صاحب ایم اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۴۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہر، پتہ ادارۂ ادبیات اردو رفعت منزل خیرت آباد حیدرآباد دکن،

اردو زبان مین سنجیدہ تصانیف کے آغاز کے ساتھ ہی مغربی زبانون کے تراجم کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، اور اس وقت اس مین ان تراجم کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے، لائق مؤلف کی تلاش وتحقیق سے جہانتک پتہ چل سکا ہے، انھون نے اس کتاب مین ان تمام ترجمون کو جمع کر دیا ہے، فورٹ ولیم کالج کے زمانہ (اٹھارھوین صدی) سے اس وقت تک چار دور قائم کئے ہین، اور ہر دور کے ماتحت اس عہد کی انفرادی اور جماعتی کوششون یعنی اشخاص اور علمی ادارون

کے تراجم کا ترتیب کے ساتھ ذکر ہے، ابتدائی دور کے ترجمون پر مختصر تبصرہ اور بعض کے نمونے بھی دیدئے ہین، مختلف فہرستون خصوصاً سجاد مرزا بیگ کی الفہرست مین کافی ترجمون کا ذکر ہے لیکن اس استیعاب کے ساتھ یہ پہلی کوشش ہے، اور بڑی حد تک کامیاب ہے، یہ موضوع ایسا ہے، کہ ممکن ہے کچھ ترجمے مرتب کے علم میں نہ آسکے ہون، جن کے اندراج کی بعد مین گنجایش باقی ہے، کتاب کے شروع مین ایک مختصر اور مفید مقدمہ بھی ہے،

تقویم ہجری و عیسوی مرتبہ جناب ابو النصر محمد خالدی صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۵۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ / پتہ انجمن ترقی اردو نئی دہلی،

تاریخ اسلام پر کام کرنے والون نے ہمیشہ ایسی تقویم کی ضرورت محسوس کی جس سے عیسوی اور ہجری سنہ کی مطابقت معلوم ہو سکے، عربی مین تو ایک سے زیادہ ایسی تقویمین ہین، ان مین سب سے بہتر حسن وفقی بک دمشقی کی تقویم المنہاج القویم ہے، اس مین سنہ عیسوی اور ہجری قمری سنہ کے ساتھ ہجری شمسی بھی بنا کر دیدیا ہے، لیکن اردو مین اس قسم کی کوئی تقویم موجود نہ تھی، مرتب نے اس تقویم کو مرتب کرکے کام کرنے والون کے لئے بڑی آسانی پیدا کر دی، اس سے سنہ ہ مطابق ۶۶۲ء سے ۱۵۰۰ھ مطابق ۲۰۷۶ء تک سنہ مہینہ اور دن تاریخ کی مطابقت معلوم ہو سکتی ہے،

حیاتِ جاوید مولینا حالی مرحوم تقطیع بڑی ضخامت ۲ حصے تقریباً ۹۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۴ / پتہ انجمن ترقی اردو نئی دہلی،

مولینا حالی کی مشہور تصنیف حیاتِ جاوید اپنی شہرت کی وجہ سے تعارف سے مستغنی ہے، جو اب غالباً کمیاب تھی، اس لئے انجمن ترقی اردو نے اسے اسی اہتمام سے چھاپا ہے، جسے اسکی ضرورت ہو وہ انجمن ترقی اردو سے منگا سکتا ہے،

"م"

"جلد ۴۵" ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۰ء "عدد ۶"

مضامین